ماہنامہ

اشراق

لاہور

جون ۲۰۱۸ء

زیرسرپرستی

جاوید احمد غامدی

’’تقویٰ کے لیے صبر ضروری ہے، اور روزہ انسان کو صبر کی تربیت دیتا ہے۔ بلکہ صبر کی تربیت کے لیے اِس سے بہتر اور اِس سے زیادہ موثر کوئی دوسرا طریقہ شاید نہیں ہوسکتا۔ دنیا میں ہم جس امتحان سے دوچار ہیں، اُس کی حقیقت اِس کے سوا کیا ہے کہ ایک طرف ہمارے حیوانی وجود کی منہ زور خواہشیں ہیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ ہے کہ ہم اُس کے حدود میں رہ کر زندگی بسر کریں؟ یہ چیز قدم قدم پر صبر کا تقاضا کرتی ہے۔ سچائی، دیانت، تحمل، بردباری، عہد کی پابندی، عدل وانصاف، عفوودرگذر، منکرات سے گریز، فواحش سے اجتناب اور حق پر استقامت کے اوصاف نہ ہوں تو تقویٰ کے کوئی معنی نہیں ہیں، اور صبر کے بغیر یہ اوصاف، ظاہر ہے کہ آدمی میں کسی طرح پیدا نہیں ہوسکتے۔‘‘

—— شذرات

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگی قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ماہنامہ

اشراق

لاہور

جلد ۳۰ شمارہ ۶ جون ۲۰۱۸ء رمضان المبارک/شوال المکرّم ۱۴۳۹ھ

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر

سید منظور الحسن

فی شمارہ 30روپے

سالانہ 300روپے

رجسٹرڈ 700روپے

(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر)

بیرون ملک

سالانہ 30ڈالر

فہرست

شذرات		
روزے کا مقصد	جاوید احمد غامدی	۴
سورۂ توبہ میں ’اَلَّذِیْنَ یَلُوْنَکُمْ مِّنَ الْکُفَّارِ‘ سے مراد	سید منظور الحسن	۶
قرآنیات		
البیان: طٰہٰ ۲۰: ۴۲-۹۸ (۳)	جاوید احمد غامدی	۹
دین و دانش		
آفات روزہ اور ان کا علاج	مولانا امین احسن اصلاحی	۳۲
رمضان، عبادات اور للّٰہیت	ساجد حمید	۳۸
سیر و سوانح		
ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا (۶)	محمد وسیم اختر مفتی	۴۵
مقالات		
زکوٰۃ: ایک مطالعۂ نو؛ فقہی قیود اور ان کے نتائج	ڈاکٹر عرفان شہزاد	۵۷
تبصرۂ کتب		
’’درِ ادراک‘‘	ڈاکٹر عرفان شہزاد	۷۸
’’درِ ادراک‘‘: ایک علمی و اصلاحی کاوش	شاہد رضا	۸۱

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
www.ghamidi.net, www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
http://www.javedahmadghamidi.com/index.php/ishraq

روزے کا مقصد

[جناب جاوید احمد غامدی کی کتاب ''میزان'' سے اقتباس]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

روزے کا مقصد قرآن مجید نے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۳ میں یہ بیان کیا ہے کہ لوگ خدا سے ڈرنے والے بن جائیں۔ اِس کے لیے اصل میں 'لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ' کے الفاظ آئے ہیں، یعنی تمھارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے۔ قرآن کی اصطلاح میں تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے شب و روز کو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود کے اندر رکھ کر زندگی بسر کرے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اِس بات سے ڈرتا رہے کہ اُس نے اگر کبھی اِن حدود کو توڑا تو اِس کی پاداش سے اللہ کے سوا کوئی اُس کو بچانے والا نہیں ہو سکتا۔

روزے سے یہ تقویٰ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اِس کو سمجھنے کے لیے تین باتیں پیش نظر رہنی چاہییں:

پہلی یہ کہ روزہ اِس احساس کو آدمی کے ذہن میں پوری قوت کے ساتھ بیدار کر دیتا ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے۔ نفس کے چند بنیادی مطالبات پر حرمت کا قفل لگتے ہی یہ احساس بندگی پیدا ہونا شروع ہوتا اور پھر بتدریج بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ روزہ کھولنے کے وقت تک یہ اُس کے پورے وجود کا احاطہ کر لیتا ہے۔ فجر سے مغرب تک کھانے کا ایک نوالہ اور پانی کا ایک قطرہ بھی روزے دار کے حلق سے نہیں گزرتا اور وہ اِن چیزوں کے لیے نفس کے ہر مطالبے کو محض اپنے پروردگار کے حکم کی تعمیل میں پورا کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ روزے کا یہ عمل جب بار بار دہرایا جاتا ہے تو یہ حقیقت روزے دار کے نہاں خانۂ وجود میں اتر جاتی، بلکہ اُس کی جبلت میں پیوست ہو جاتی ہے کہ وہ ایک پروردگار کا بندہ ہے اور اُس کے لیے زیبا یہی ہے کہ زندگی کے باقی معاملات میں بھی تسلیم و اعتراف کے ساتھ وہ اپنے مالک کی فرماں روائی کے سامنے سپر ڈال دے اور خیال و عمل، دونوں میں اپنی آزادی اور خود مختاری کے ادعا سے دست بردار

ہو جائے۔ اِس سے، ظاہر ہے کہ خدا پر آدمی کا ایمان ہر لحاظ سے زندہ ایمان بن جاتا ہے، جس کے بعد وہ محض ایک خدا کو نہیں، بلکہ ایک ایسی سمیع و بصیر، علیم و حکیم اور قائم بالقسط ہستی کو مانتا ہے جو اُس کے تمام کھلے اور چھپے سے واقف ہے اور جس کی اطاعت سے وہ کسی حال میں انحراف نہیں کر سکتا۔ تقویٰ پیدا کرنے کے لیے سب سے مقدم چیز یہی ہے۔

دوسری یہ کہ روزہ اِس احساس کو بھی دل کے اعماق اور روح کی گہرائیوں میں اتار دیتا ہے کہ آدمی کو ایک دن اپنے پروردگار کے حضور میں جواب دہی کے لیے پیش ہونا ہے۔ ماننے کو تو یہ بات ہر مسلمان مانتا ہے، لیکن روزے میں جب پیاس تنگ کرتی، بھوک ستاتی اور جنسی جذبات پوری قوت کے ساتھ اپنی تسکین کا تقاضا کرتے ہیں تو ہر شخص جانتا ہے کہ تنہا یہی احساس جواب دہی ہے جو آدمی کو بطن و فرج کے اِن مطالبات کو پورا کرنے سے روک دیتا ہے۔ رمضان کا پورا مہینا ہر روز گھنٹوں وہ نفس کے اِن بنیادی تقاضوں پر محض اِس لیے پہرا لگائے رکھتا ہے کہ اُسے ایک دن اپنے مالک کو منہ دکھانا ہے۔ یہاں تک کہ سخت گرمی کی حالت میں حلق پیاس سے چٹختا ہے، برفاب سامنے ہوتا ہے، وہ چاہے تو آسانی سے پی سکتا ہے، مگر نہیں پیتا؛ بھوک کے مارے جان نکل رہی ہوتی ہے، کھانا موجود ہوتا ہے، مگر نہیں کھاتا؛ میاں بیوی جوان ہیں، تنہائی میسر ہے، چاہیں تو اپنی خواہش پوری کر سکتے ہیں، مگر نہیں کرتے۔ یہ ریاضت کوئی معمولی ریاضت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں جواب دہی کا احساس اِس سے دل و دماغ میں پوری طرح راسخ ہو جاتا ہے۔ تقویٰ پیدا کرنے کے لیے، اگر غور کیجیے تو دوسری موثر ترین چیز یہی ہے۔

تیسری یہ کہ تقویٰ کے لیے صبر ضروری ہے، اور روزہ انسان کو صبر کی تربیت دیتا ہے۔ بلکہ صبر کی تربیت کے لیے اِس سے بہتر اور اِس سے زیادہ موثر کوئی دوسرا طریقہ شاید نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں ہم جس امتحان سے دوچار ہیں، اُس کی حقیقت اِس کے سوا کیا ہے کہ ایک طرف ہمارے حیوانی وجود کی منہ زور خواہشیں ہیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ ہے کہ ہم اُس کے حدود میں رہ کر زندگی بسر کریں؟ یہ چیز قدم قدم پر صبر کا تقاضا کرتی ہے۔ سچائی، دیانت، تحمل، بردباری، عہد کی پابندی، عدل و انصاف، عفو و درگذر، منکرات سے گریز، فواحش سے اجتناب اور حق پر استقامت کے اوصاف نہ ہوں تو تقویٰ کے کوئی معنی نہیں ہیں، اور صبر کے بغیر یہ اوصاف، ظاہر ہے کہ آدمی میں کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتے۔

روزے کا مقصد یہی تقویٰ ہے اور اِس کے لیے اللہ نے رمضان کا مہینا مقرر فرمایا ہے۔ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اِس کی وجہ اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ اِس مہینے میں قرآن نازل ہونا شروع ہوا ہے۔ روزے کے مقصد سے اِس کا کیا تعلق ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت میں لکھا ہے:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

''غور کرنے والے کو اِس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی الجھن نہیں پیش آ سکتی کہ خدا کی تمام نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت عقل ہے اور عقل سے بھی بڑی نعمت قرآن ہے، اِس لیے کہ عقل کو بھی حقیقی رہنمائی قرآن ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تو عقل سائنس کی ساری دوربینیں اور خردبینیں لگا کر بھی اندھیرے میں بھٹکتی رہتی ہے۔ اِس وجہ سے جس مہینے میں دنیا کو یہ نعمت ملی، وہ سزاوار تھا کہ وہ خدا کی تکبیر اور اُس کی شکرگزاری کا خاص مہینا ٹھیرا دیا جائے تا کہ اِس نعمت عظمیٰ کی قدروعظمت کا اعتراف ہمیشہ ہمیشہ ہوتا رہے۔ اِس شکرگزاری اور تکبیر کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزوں کی عبادت مقرر فرمائی جو اُس تقویٰ کی تربیت کی خاص عبادت ہے جس پر تمام دین وشریعت کے قیام وبقا کا انحصار ہے، اور جس کے حاملین ہی کے لیے درحقیقت قرآن ہدایت بن کر نازل ہوا ہے۔... گویا اِس حکمت قرآنی کی ترتیب یوں ہوئی کہ قرآن حکیم کا حقیقی فیض صرف اُن لوگوں کے لیے خاص ہے جن کے اندر تقویٰ کی روح ہو اور اِس تقویٰ کی تربیت کا خاص ذریعہ روزے کی عبادت ہے۔ اِس وجہ سے رب کریم وحکیم نے اِس مہینے کو روزوں کے لیے خاص فرما دیا جس میں قرآن کا نزول ہوا۔ دوسرے لفظوں میں اِس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قرآن اِس دنیا کے لیے بہار ہے اور رمضان کا مہینا موسم بہار اور یہ موسم بہار جس فصل کو نشوونما بخشتا ہے، وہ تقویٰ کی فصل ہے۔'' (تدبرقرآن ۱/۴۵۱)

—— جاوید احمد غامدی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سورۂ توبہ میں 'الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ' سے مراد

سورۂ توبہ کی آیت کے الفاظ 'الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ' سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس کے جواب میں بعض اہل علم کا خیال ہے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی اور جناب جاوید احمد غامدی، تینوں ان سے 'منافقین' مراد لیتے ہیں۔ مولانا مودودی کی حد تک تو اُن کی بات بالکل درست ہے، مگر اصلاحی صاحب اور غامدی صاحب کے حوالے سے درست نہیں ہے۔ دونوں علما کے تراجم اور تفاسیر اس غلط فہمی کی واضح تردید کر رہے ہیں۔

مولانا اصلاحی کا ترجمہ یہ ہے:

''اے ایمان والو، تمھارے گردوپیش جو کفار ہیں، ان سے لڑو اور چاہیے کہ وہ تمھارے رویہ میں سختی محسوس کریں اور

جان رکھو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔''

غامدی صاحب نے یہ ترجمہ کیا ہے:

''ایمان والو، (اِن تنبیہات کے بعداب نکلو اور جس طرح کہ پیچھے حکم دیا گیا ہے کہ)، اپنے گردوپیش کے منکروں سے جنگ کرو، اور چاہیے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائیں، تم جان لو کہ اللہ اُن کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرنے والے ہوں۔''

مولانا اصلاحی کی تفسیر یہ ہے:

''یہ آیت پوری سورہ کے اصل مضمون کا خلاصہ ہے۔ جیسا کہ آپ نے دیکھا، کفار ومشرکین پر اتمام حجت ہو چکنے کے بعد ان سے اعلان براءت اور ان کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ آیات ۲۳-۲۴ کے تحت یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ منافقین اپنے پاس پڑوس کے کفار ومشرکین سے عزیزانہ و دوستانہ روابط اور دوسرے کاروباری مفادات وابستہ رکھنے کے سبب سے، اس بات کے لیے تیار نہیں تھے کہ ان سے جنگ کریں یا اپنے تعلقات ان سے یک قلم ختم کر لیں۔ ان کی اس منافقت کی اچھی طرح قلعی کھولنے اور ایمان، تقویٰ اور صداقت کے حقیقی مقتضیات تفصیل سے واضح کر دینے کے بعد اب یہ دین کا اصل مطالبہ ان کے سامنے پھر رکھ دیا گیا ہے۔ خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن قرینہ پتا دے رہا ہے کہ روے سخن ان ہی کی طرف ہے۔ فرمایا کہ 'قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ'، یعنی جو کفار تمھارے پاس پڑوس اور گردوپیش میں ہیں، ان سے جنگ کرو۔ گردوپیش کے کفار جس طرح تمھاری دعوت ایمان وہدایت کے سب سے زیادہ حق دار تھے، اسی طرح اب، اللہ اور رسول کی طرف سے اتمام حجت اور اعلان جنگ کے بعد، تمھاری تلواروں کے بھی سب سے زیادہ سزاوار یہی ہیں، جو لوگ قرابت داری، دوستی اور اپنے دنیوی مفاد کی خاطر ان کے معاملے میں مداہنت برتیں گے، وہ جیسا کہ آیت ۲۳ میں فرمایا ہے، اپنی جانوں پر سب سے زیادہ ظلم ڈھانے والے ٹھیریں گے اور انھی کے لیے آیت ۲۴ میں یہ وعید ہے کہ تم انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمھارے باب میں اپنا فیصلہ صادر فرما دے۔ یہ حقیقت ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کی جا چکی ہے کہ ایمان واخلاص کی اصل روح اس وقت بیدا ہوتی ہے، جب اس کی خاطر اپنوں سے جنگ کرنی پڑے۔ 'يَلُوْنَكُمْ' کی قید اسی پہلو کو نمایاں کر رہی ہے۔ 'وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً'، یعنی اب وہ تمھارے طرز عمل سے یہ محسوس کر لیں کہ تمھارے اندر ان کے لیے موالات، دوستی اور محبت کی کوئی جگہ باقی نہیں رہ گئی ہے، بلکہ جس طرح وہ من حیث القوم تمھارے اور تمھارے دین کے دشمن ہیں، اسی طرح تم بھی من حیث الجماعت ان کے اور ان کے دین کے دشمن بنو۔ اب تک وہ تمھارے دل میں اپنے لیے بڑا نرم گوشہ پاتے تھے، اس وجہ سے ان کو توقع تھی کہ وہ اپنے مقاصد کے لیے تم کو برابر

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

استعمال کرتے رہیں گے۔ اب یہ حالت یک قلم ختم ہو جانی چاہیے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۶۶۳)

غامدی صاحب کا حاشیہ یہ ہے:

''آیت میں خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن روے سخن اُنھی منافقین کی طرف ہے جو اپنی دوستیوں، رشتہ داریوں اور کاروباری تعلقات کے پیش نظر اُن لوگوں کے خلاف کسی اقدام کے لیے تیار نہیں تھے جن کے ساتھ اِس سورہ میں جنگ کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہر شخص کو اُنھی سے لڑنا ہے جو اُس کے گردوپیش میں رہتے ہیں اور کسی نہ کسی لحاظ سے اُس کے اپنے ہیں۔ ایمان و اخلاص کا اصلی امتحان اِسی سے ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ گوسالہ پرستی کے جرم کی پاداش میں جب بنی اسرائیل کے قتل عام کا حکم دیا گیا تھا تو اُس میں بھی یہی تقاضا کیا گیا تھا۔ آیت میں 'یَلُوْنَکُمْ' کی قید اِسی پہلو کو نمایاں کر رہی ہے۔'' (البیان ۲/ ۴۰۳)

میرے فہم کی حد تک ان اقتباسات سے درج ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں:

۱۔ یہ آیت سورہ کے اصل مضمون کا خلاصہ ہے۔

۲۔ سورہ کا اصل مضمون 'کفار' اور 'مشرکین' سے اعلان براءت اور اعلان جنگ ہے۔

۳۔ اس آیت میں اہل ایمان کو 'کفار' اور 'مشرکین' کے خلاف جنگ لڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔

۴۔ 'کفار' اور 'مشرکین' کے خلاف جنگ لڑنے کا یہ حکم عام ہے جو ایمان کا اظہار کرنے والے سب مسلمانوں کو ان کی عمومی حیثیت میں دیا گیا ہے، یعنی مومنین (سچے اہل ایمان) اور منافقین (جھوٹے اہل ایمان) کی کوئی تفریق نہیں کی گئی۔

۵۔ تاہم، روے سخن یا کلام کا رخ منافقین (جھوٹے اہل ایمان) کی طرف ہے اور مقصود یہ نمایاں کرنا ہے کہ آیا وہ اس حکم کی تعمیل میں مومنین (سچے اہل ایمان) کے شانہ بشانہ کفار و مشرکین کے خلاف برسر جنگ ہوتے ہیں یا نہیں اور اس طرح ان کے دعویٰ ایمان کی قلعی کھولنا ہے۔

۶۔ روے سخن منافقین کی طرف ہونے کا قرینہ 'یَلُوْنَکُمْ مِّنَ الْکُفَّارِ' (تمھارے گردوپیش جو کفار ہیں) کے الفاظ ہیں۔ اسی سورہ کی آیات ۲۳-۲۴ سے واضح ہے کہ ایمان لانے والوں کے گردوپیش میں کفار و مشرکین ان کے باپوں، بیٹوں، بھائیوں، بیویوں، رشتہ داروں اور دوستوں کی صورت میں موجود تھے اور جنھیں منافقین (جھوٹے اہل ایمان) نے اللہ، اس کے رسول اور جہاد سے زیادہ عزیز بنا رکھا تھا۔

—— سید منظور الحسن

قرآنیات

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ طٰہٰ

(۳)

(گذشتہ سے پیوستہ)

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿۴۲﴾ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ
طَغٰى ﴿۴۳﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾

(اِس کے بعد موسیٰ مصر پہنچے تو ارشاد ہوا): تم اور تمھارا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ جاؤ اور دیکھو، میرے ذکر میں سستی نہ کرنا۔[۵۶] تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ سو اُس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا،[۵۷] شاید وہ یاددہانی حاصل کرے یا میرے عتاب سے ڈرے۔[۵۸] ۴۲-۴۴

۵۶؎ موسیٰ علیہ السلام کی تسکین و تسلی کے بعد یہ اب اُسی حکم کا اعادہ ہے جو طور سینا کے دامن میں دیا گیا تھا۔ چنانچہ فرمایا کہ دونوں جاؤ اور فرعون کو انذار کرو اور اِس انذار و دعوت کے دوران میں کوئی غفلت نہیں ہونی چاہیے، نہ مجھے یاد کرنے میں اور نہ دوسروں کو میری یاددہانی کرانے میں۔

۵۷؎ انبیا علیہم السلام اپنی دعوت ہمیشہ اِسی اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔ یہ اُسی کی تاکید ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿۴۵﴾ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ
مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿۴۶﴾ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ

اُنھوں نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار، ہمیں اندیشہ ہے کہ اِس کو سنتے ہی وہ ہم پر زیادتی کرے یا اُس کی سرکشی کچھ اور بڑھ جائے۔[59] فرمایا: اندیشہ نہ کرو، میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، (سب کچھ) سنتا اور دیکھتا ہوں۔[60] سو اُس کے پاس جاؤ اور اُس سے کہو کہ ہم تیرے رب کے فرستادے ہیں،[61]

''... اِس ہدایت کی ضرورت صرف اِس پہلو سے نہیں تھی کہ اب حضرت موسیٰ فرعون کے سامنے ایک بے بس اسرائیلی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ خدا کے ایک سفیر کی حیثیت سے جا رہے تھے اور ہاتھ میں عصاے موسوی بھی تھا، بلکہ لینت اور نرمی دعوت حق کی فطرت ہے۔ حضرات انبیا کی بعثت تعلیم و اصلاح کے لیے ہوئی، اِس وجہ سے اُن کی دعوت اور اُن کے انذار میں ایک معلم کی شفقت اور ایک غم گسار کی دل سوزی ہمیشہ نمایاں رہی ہے۔ کسی نبی کے متعلق یہ بات علم میں نہیں آئی کہ اُس نے ہیکڑی جتائی اور دھونس جمائی ہو۔ سخت سے سخت حالات میں بھی اُن کا طرز خطاب اور انداز جواب نہایت ہی نرم، موثر اور ہم دردانہ رہا ہے۔''

(تدبر قرآن ۵/۵۳)

۵۸؎ یعنی غفلت سے بیدار ہو یا اگر یہ نہیں تو میرے عتاب کے خوف ہی سے متوجہ ہو کر سننے اور سمجھنے کے لیے تیار ہو جائے۔

۵۹؎ یعنی کچھ سننے اور سمجھنے سے پہلے ہی ہم پر ہاتھ ڈال دے یا ہماری بات سنتے ہی برہم ہو کر بنی اسرائیل پر اور زیادہ ظلم و ستم کرنے لگے۔ آیت میں 'يَفْرُطَ' کے بعد 'عَلٰى' ہے، جس سے کسی کے خلاف عاجلانہ اقدام کے معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ یہی معاملہ 'اَنْ يَّطْغٰى' کا ہے۔ اوپر 'اِنَّهٗ طَغٰى' کے بعد اب وہ بھی محض طغیان کے معنی میں نہیں رہا۔ ہم نے ترجمہ اِنھی سب چیزوں کے لحاظ سے کیا ہے۔

۶۰؎ اِس اجمال میں جو تفصیل مضمر ہے اور 'سنتا اور دیکھتا ہوں' کے الفاظ جس سطوت و جلالت اور تحفظ و ضمانت کو ظاہر کر رہے ہیں، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

۶۱؎ اصل میں 'رَسُوْل' کا لفظ ہے۔ یہ نبوت سے آگے ایک خاص منصب کے حاملین کے لیے بھی آتا ہے اور خدا کے فرستادوں کے لیے ایک عام لفظ کے طور پر بھی۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ یہ اِسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

وَلَا تُعَذِّبْهُمْ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿۴۷﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۴۸﴾

اِس لیے بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دو[۶۲] اور اُن کو ستاؤ نہیں۔ ہم تیرے پروردگار کی طرف سے ایک بڑی نشانی لے کر تیرے پاس آئے ہیں اور (یہ پیغام بھی کہ) سلامتی اُنھی پر ہے جو ہدایت کی پیروی کریں[۶۳]۔ ہم کو وحی کی گئی ہے کہ اُن پر، البتہ عذاب ہے جو جھٹلائیں اور منہ موڑیں[۶۴]۔ ۴۵ - ۴۸

۶۲۔ بنی اسرائیل کو ساتھ لے جانے کا یہ مطالبہ، معاذ اللہ کسی قوم پرست لیڈر کی طرف سے اپنی قوم کو غلامی سے چھڑانے کا مطالبہ نہیں تھا، بلکہ خدا کی اُس اسکیم کو بروے کار لانے کے لیے کیا گیا تھا، جس کے تحت سیدنا ابراہیم کی ذریت کو عالمی سطح پر ابلاغ دعوت اور اتمام حجت کے لیے منتخب کیا گیا۔ اِس اسکیم کے مطابق یہ ضروری تھا کہ اُنھیں ایک خاص علاقے میں آباد کر کے وہاں دعوت حق کا مرکز قائم کیا جائے۔ بائیبل کی کتاب خروج کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ پوری اسکیم فرعون اور اُس کے درباریوں کے سامنے واضح نہیں فرمائی، بلکہ صرف اتنا کہا کہ وہ قربانی کی عبادت کے لیے تین دن کی راہ بیابان میں جانا چاہتے ہیں، اِس لیے کہ جس چیز کی قربانی کرنا پیش نظر ہے، اُس کی قربانی اگر مصر میں کی گئی تو وہاں کے لوگ اُنھیں سنگ سار کر دیں گے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۶۳۔ یہ دعوت کا بڑا ہی موثر اسلوب ہے، جس میں تنبیہ اور خیر خواہی، دونوں کی آمیزش محسوس کی جا سکتی ہے۔

۶۴۔ اِس آیت میں لطافت بیان کے جو پہلو ملحوظ ہیں، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک تو یہ کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون نے عام لیڈروں کی طرح فرعون پر اپنی طرف سے عذاب کی کوئی دھونس جمانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ اُس کو صرف اللہ تعالیٰ کی اُس وحی کی خبر دی جو اُن پر آئی تھی کہ تکذیب اور اعراض کرنے والوں پر اللہ کا عذاب آ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ اُنھوں نے اِسی لیے اختیار فرمایا کہ اپنی طرف سے فرعون کے لیے کوئی وجہ اشتعال نہ پیدا ہونے دیں۔

دوسری یہ کہ اُنھوں نے فرعون کو مخاطب کر کے یوں نہیں فرمایا کہ اگر تو جھٹلائے گا اور اعراض کرے گا تو تجھ پر عذاب الٰہی آ دھمکے گا، بلکہ بصیغۂ عام یوں فرمایا کہ جو ایسا کرے گا، اُس کا انجام یہ ہوگا تاکہ فرعون کے کانوں میں بات پڑ بھی جائے اور اُس کی انانیت کو ٹھیس بھی نہ لگے۔

تیسری یہ کہ 'كَذَّبَ' کے مفعول اور 'تَوَلّٰى' کے متعلق، دونوں کو یہاں حذف کر دیا۔ یوں نہیں فرمایا کہ جو ہماری

قَالَ فَمَنۡ رَّبُّکُمَا یٰمُوۡسٰی ﴿۴۹﴾ قَالَ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی ﴿۵۰﴾ قَالَ فَمَا بَالُ الۡقُرُوۡنِ الۡاُوۡلٰی ﴿۵۱﴾ قَالَ عِلۡمُہَا عِنۡدَ رَبِّیۡ فِیۡ

(اُنھوں نے یہی بات آکر کہہ دی تو) فرعون نے پوچھا: اچھا تو پھر تم دونوں کا رب کون ہے، اے موسیٰ؟[۶۵] اُس نے جواب دیا: ہمارا رب وہی ہے، جس نے ہر چیز کو اُس کی خِلقت عطا کی، پھر رہنمائی فرمائی ہے۔[۶۶] فرعون نے کہا: پھر اگلی قوموں کا کیا حال ہے[۶۷]؟ موسیٰ نے جواب دیا: اُن کا

رسالت کی تکذیب اور ہماری لائی ہوئی ہدایت سے اعراض کرے گا، اُس پر عذاب آئے گا۔ اِس لیے کہ یہ بات ازخود واضح تھی اور اِس کے اظہار سے بھی بہرحال فرعون کے پندار کو چوٹ لگتی۔'' (تدبر قرآن ۵/۵۵)

۶۵؎ یہ سوال طنز وتحقیر کے لیے ہے اور جس ذہنی پس منظر کے ساتھ کیا گیا ہے، وہ قرآن نے دوسرے مقامات میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ پورا مصر تو سورج دیوتا کے مظہر کی حیثیت سے مجھے اپنا پروردگار مانتا ہے، پھر یہ تم دونوں کس پروردگار کے رسول بن کر آ گئے ہو؟ اِس سے پہلے تو میں نے کسی ایسے پروردگار کا ذکر تم لوگوں سے نہیں سنا جو میری بادشاہی میں مداخلت کرے اور مجھ سے کہے کہ میں بنی اسرائیل کو تمھارے ساتھ جانے دوں۔ زمین وآسمان کا کوئی خالق ہے تو ہوا کرے، اِس سرزمین کے لوگوں کا رب اور معبود تو میں ہی ہوں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmedghamidi.com

۶۶؎ یہ جواب نہایت مختصر ہے، مگر اپنے اندر حقائق ومعارف کی ایک دنیا لیے ہوئے ہے۔ اِس سے موسیٰ علیہ السلام نے نہایت بلیغ اسلوب میں یہ حقیقت فرعون پر واضح کر دی ہے کہ رب ہونے کا حق دار فی الواقع کون ہو سکتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہر شے اپنے مقصد وجود کے اعتبار سے ایک خاص قالب وہیئت رکھتی ہے اور پھر اِس مقصد وجود کی تحصیل وتکمیل کے لیے اپنے اندر ایک جبلی رہنمائی بھی رکھتی ہے۔ شہد کی مکھی کو جس مقصد کے لیے خالق نے پیدا کیا ہے، اُس کی تکمیل کے لیے اُس کے ننھے سے وجود کے اندر اُس نے وہ تمام قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں جو اُس کے لیے ضروری ہیں اور پھر اُس کی جبلت کو یہ الہام بھی فرما دیا کہ وہ کس طرح اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرے اور اپنے لیے شہد کا ذخیرہ فراہم کرے۔ یہی حال اِس کائنات کی ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز کا ہے۔ ایک چیونٹی، ایک بھنگا، ایک مکڑی، ایک بکری، ایک شیر، سب کو قدرت کی طرف سے ایک خاص نوع کی خلقت اور اُس کی ضرورت کے اعتبار سے ایک جبلی ہدایت عطا ہوئی ہے۔ سب کو خدا نے الہام فرمایا ہے کہ کس طرح اور کس نوع کی اپنے لیے غذا حاصل کریں، کس طرح توالد وتناسل کا سلسلہ قائم کریں، کس

طرح اپنی اور اپنی نسل کی حفاظت کریں، کس چیز سے بچیں، اور کس چیز کو اختیار کریں اور پھر کس طرح اِس کائنات کی مجموعی خدمت میں اپنا فریضہ ادا کریں۔

بلبل کی نغمہ سنجی، طوطی کی شکرفشانی اور کوئل کی کوک کس کا الہام ہے؟ ظاہر ہے کہ اُن کے خالق ہی کا! تو وہی خالق اُن کا اور سب کا رب بھی ہے۔

صرف جان دار چیزوں ہی تک قدرت کا یہ فیض محدود نہیں ہے، بلکہ چمن کے بیل بوٹے جو ثمر باری اور گل ریزی کرتے ہیں؛ سوسن، بنفشہ، گلاب اور سرو وصنوبر جو چمن آرائی کرتے ہیں؛ سیب، انار اور انگور جو دعوت شوق دیتے ہیں، آخر یہ کس کی بخشی ہوئی خلقت اور یہ کس کی عطا کردہ جبلت ہے؟ آخر کون ہے جو اِن میں سے کسی ایک چیز کے بھی خلق کا دعویٰ کر سکے یا یہ کہہ سکے کہ یہ اُس کا کرشمہ ہے کہ اُس نے سیب کے اندر سیب کی خاصیت ودیعت کی اور کیکر کے اندر کیکر کی؟ چمن کے ہر پودے، میدان کی ہر گھاس اور جنگل کی ہر جھاڑی میں یہ الگ الگ مزاج، الگ الگ رنگ و بو اور الگ الگ فوائد ونقصانات کون ودیعت کرتا ہے؟ جو کرتا ہے، وہی رب ہے، نہ کہ ہر خرنا مشخص جو سر پر تاج اوڑھ لے اور خدائی کا دعوے دار بن بیٹھے، وہ رب بن جائے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

زمین ہی نہیں، ایک نظر آسمان پر بھی ڈالیے۔ یہ سورج، یہ چاند، یہ کہکشاں، یہ قوس قزح، یہ آسمان، یہ ابر، یہ ہوا، آخر کس نے اِن کو پیدا کیا اور کون ہے، جس نے اِن کے فرائض اِن کو الہام کیے؟ جس نے اِن کو پیدا کیا اور اِن کو اِن کے فرائض الہام کیے، وہی رب ہے۔ سورج کا اوتار بن کر تخت پر براجمان ہو جانا تو بہت آسان ہے، لیکن کون ہے جو ایک منٹ کے لیے سورج کو اُس کے وقت سے پہلے نمودار کر سکے یا افق سے اُس کو غائب کر سکے؟

اِس کائنات میں اشرف المخلوقات کی حیثیت انسان کو حاصل ہے۔ اُس کو قدرت نے بہترین خلقت بھی عطا فرمائی ہے اور نہایت اعلیٰ صلاحیتوں سے بھی نوازا ہے، لیکن نہ کسی کو اپنی خلقت کے معاملے میں کوئی دخل ہے، نہ اپنی صلاحیتوں کی تخلیق ہی میں کسی کا کوئی حصہ ہے۔ یہ خدا ہی ہے، جس نے ہمیں ہاتھ، پاؤں، ناک، کان اور آنکھ کی قوتیں دیں اور اُسی نے ہمیں جبلت وفطرت اور عقل وادراک وشعور کی نعمتیں بخشیں۔ یہ اِنھی چیزوں کا فیض ہے کہ آج خشکی وتری، دریا اور پہاڑ سب ہمارے لیے یکساں ہیں۔ ہم سمندروں کا سینہ چیرتے اور فضاؤں میں اڑتے ہیں۔ ہماری رسائی زمین کے بعید ترین گوشوں اور کونوں ہی تک نہیں، بلکہ چاند اور مریخ تک ہے۔ بجلی اور ایٹم، سب پر ہمارا تصرف ہے۔ یہ سب کچھ ہے، لیکن ایک لمحے کے لیے بھی یہ مغالطہ نہ ہو کہ یہ آپ کی اپنی پیدا کردہ صلاحیتوں کا کرشمہ ہے! جو اِس مغالطے میں ہے، وہ احمق ہے! یہ سب خدا کی بخشی ہوئی عقل کا کرشمہ ہے، جس کی بدولت انسان قدرت کے کچھ نوامیس دریافت کر کے چاند اور مریخ پر تاخت کرتا پھر رہا ہے۔ اگر یہ خدا کی بخشی ہوئی عقل کی رہنمائی سے اُس کے کچھ قوانین دریافت کر لے اور اُن سے فائدہ اٹھانے کی قابلیت پیدا کر لے تو اِس پر اتنا

كِتٰبٍ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴿٥٢﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ
لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ
شَتّٰى ﴿٥٣﴾ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿٥٤﴾ مِنْهَا

علم میرے پروردگار کے پاس ایک نوشتے میں محفوظ ہے۔ میرا رب نہ بھٹکتا ہے، نہ بھولتا ہے[۶۸] ___ وہی[۶۹] جس نے زمین کو تمھارے لیے گہوارہ بنایا اور اُس میں تمھارے لیے راہیں نکال دیں اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اُس سے ہم نے مختلف نباتات کی گوناگوں قسمیں پیدا کر دیں۔ کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو چراؤ۔ اِس کے اندر عقل والوں کے لیے، یقیناً بڑی نشانیاں ہیں[۷۰]۔ (تم اگر سمجھو تو حقیقت

مغرور نہ ہو جائے کہ خدا کی خدائی ہی کو چیلنج کر دے۔'' (تدبر قرآن ۵/۵۶)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۶۷؎ یعنی اُن کا انجام کیا ہوا؟ وہ بھی تو ہمارے اِسی دین کے ماننے والے تھے۔ یہ، ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی تذکیر پر سنجیدہ طریقے سے غور کرنے کے بجاے بات کا رخ پھیرنے اور اپنے گرد و پیش کے لوگوں کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لیے فرعون کی شرارت تھی۔ اِس سے مقصود یہ تھا کہ اُس کے اہل دربار جب اپنے بزرگوں پر موسیٰ علیہ السلام کی تنقید سنیں گے تو یقیناً بھڑک اُٹھیں گے اور اِس کے نتیجے میں اُس کا بھرم قائم رہ جائے گا۔ وہ اِس بات کی طرف توجہ نہیں کریں گے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اُسے لاجواب کر دیا ہے۔

۶۸؎ مطلب یہ ہے کہ خاطر جمع رکھو، اُنھوں نے جو کچھ مانا اور جو کچھ کیا ہے، وہ سب میرے رب کے ریکارڈ میں محفوظ ہے اور یہ خیال نہ کرو کہ اُس میں سے کوئی چیز رہ گئی ہو گی یا صحیح طریقے سے ثبت نہیں ہوئی ہو گی یا میرا رب اُس کو بھول گیا ہو گا۔ وقت آنے پر وہ اُن کی ہر چیز سامنے لے آئے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ آخری بات الفاظ میں بیان نہیں کی، لیکن انداز کلام اِس کو صاف ظاہر کر رہا ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، یہ اِس لیے کہ بعض مواقع میں کنایہ جتنا موثر ہوتا ہے، صراحت اتنی موثر نہیں ہوتی۔

۶۹؎ یہاں سے آگے کی آیتیں موسیٰ علیہ السلام کے کلام کا حصہ نہیں ہیں، بلکہ تضمین کے طور پر براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور اِن میں سورہ کے مخاطبین، یعنی قریش مکہ کو خطاب کر کے اُنھی حقائق کی تفصیل کر دی ہے جن کی طرف موسیٰ علیہ السلام نے اوپر بالاجمال اشارہ کیا ہے۔ قرآن میں اِس کی مثالیں کئی جگہ موجود ہیں۔

۷۰؎ یعنی اِس بات کی نشانیاں کہ جس کی قدرت و حکمت کے یہ کرشمے ہر طرف دیکھ رہے ہو، وہی تمھارا رب ہے

خَلَقۡنٰکُمۡ وَ فِیۡهَا نُعِیۡدُکُمۡ وَ مِنۡهَا نُخۡرِجُکُمۡ تَارَةً اُخۡرٰی ﴿۵۵﴾

وَ لَقَدۡ اَرَیۡنٰهُ اٰیٰتِنَا کُلَّهَا فَکَذَّبَ وَ اَبٰی ﴿۵۶﴾ قَالَ اَجِئۡتَنَا لِتُخۡرِجَنَا مِنۡ اَرۡضِنَا
بِسِحۡرِکَ یٰمُوۡسٰی ﴿۵۷﴾ فَلَنَاۡتِیَنَّکَ بِسِحۡرٍ مِّثۡلِهٖ فَاجۡعَلۡ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکَ مَوۡعِدًا لَّا نُخۡلِفُهٗ
نَحۡنُ وَ لَاۤ اَنۡتَ مَکَانًا سُوًی ﴿۵۸﴾

یہ ہے کہ) ہم نے اِسی زمین سے تم کو پیدا کیا ہے، ہم اِسی میں تم کو لوٹائیں گے اور اِسی سے تم کو دوبارہ نکال کھڑا کریں گے۔ ۴۹-۵۵

ہم نے فرعون کو اپنی سب نشانیاں دکھا دیں[۱]۔ اِس پر بھی وہ جھٹلائے چلا گیا اور نہیں مانا۔ اُس نے کہا: موسیٰ، کیا تم اِس لیے ہمارے پاس آئے ہو کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے ملک سے نکال باہر کرو[۲]؟ یہی بات ہے تو ہم بھی تمھارے مقابل میں ایسا ہی جادو لے کر آ جائیں گے۔ سو ہمارے اور اپنے درمیان ایک وعدہ ٹھیرا لو، کوئی بیچ کی جگہ[۳]، نہ ہم اُس کی خلاف ورزی کریں نہ تم کرو گے۔ ۵۶-۵۸

اور وہی اِس کا سزاوار ہے کہ اُس کو رب مانا جائے۔ پھر یہی نہیں، اُس کا یہ اہتمام ربوبیت اِس بات کا بھی تقاضا کرتا ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے، جس میں اُس کے کامل عدل کا ظہور ہو اور یہ اُس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ چنانچہ یہی نتیجہ ہے جسے اگلی آیت میں بیان کر دیا ہے کہ جس مٹی سے پیدا کیے گئے ہو، اُسی میں دفن ہو گے اور اُسی سے ایک دن نکال کھڑے کیے جاؤ گے۔

۱؎ یہ اُن نشانیوں کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر سورۂ اعراف (۷) میں ہوا ہے۔ ہم نے آیت ۱۳۳ کے تحت وہاں اِن نشانیوں کی تفصیل کر دی ہے۔

۲؎ یعنی لوگوں کو متاثر کر کے اپنے پیچھے لگا لو اور وہ ہمارے خلاف بغاوت کر کے ہم کو ہمارے ملک سے نکال دیں۔ فرعون نے یہ بات اِس لیے کہی کہ ایک تو اِس سے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا اثر مٹانے کی کوشش کی جائے، دوسرے اُنھیں ایک سیاسی خطرہ قرار دے کر اپنے اعیان و اکابر اور اپنی قوم کے لوگوں کو ایسا مشتعل کر دیا جائے کہ وہ اُن کی دعوت کی طرف متوجہ ہی نہ ہو سکیں۔

۳؎ یعنی جہاں ہمارے اور تمھارے آدمی آسانی کے ساتھ جمع ہو سکیں۔

قَالَ مَوۡعِدُكُمۡ يَوۡمُ الزِّيۡنَةِ وَاَنۡ يُّحۡشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾ فَتَوَلّٰى فِرۡعَوۡنُ
فَجَمَعَ كَيۡدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿۶۰﴾ قَالَ لَهُمۡ مُّوۡسٰى وَيۡلَكُمۡ لَا تَفۡتَرُوۡا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا
فَيُسۡحِتَكُمۡ بِعَذَابٍ وَقَدۡ خَابَ مَنِ افۡتَرٰى ﴿۶۱﴾

موسیٰ نے کہا: تمھارے ساتھ جشن کے دن کا وعدہ ہے[۴] اور یہ کہ (اِس کے لیے) لوگ دن چڑھے جمع کیے جائیں گے[۵]۔ (یہ بات طے ہوگئی) تو فرعون وہاں سے ہٹا اور اپنے سارے داؤ اکٹھے کیے[۶]، پھر مقابلے پر آ گیا۔ (اُس دن، جب لوگ جمع ہوئے تو) موسیٰ نے (مقابلے سے پہلے اُنھیں تنبیہ کی)، فرمایا: شامت کے مارو، (اللہ کے شریک ٹھیرا کر) تم اللہ پر جھوٹ نہ باندھو کہ کسی عذاب سے وہ تمھاری جڑ اکھاڑ دے[۷]۔ (یاد رکھو)، خدا پر جس نے بھی جھوٹ باندھا، وہ نامراد ہوا ہے[۸]۔ ۵۹-۶۱

۴؎ یہ غالباً کسی میلے یا فرعون کی سال گرہ کا دن تھا، جس کی تاریخ اُس وقت سامنے تھی۔ اِسے 'يَوْمُ الزِّيْنَةِ' اِس لیے کہا ہے کہ لوگ اِس طرح کے موقعوں پر اپنے آپ کو بھی آراستہ کرتے اور شہروں کو بھی سجاتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہی دن نامزد کر دیا کہ جب لوگ تمام ملک سے کھچ کر وہاں پہنچے ہوئے ہوں گے تو سب کے سامنے اور دن کی پوری روشنی میں وہیں فرعونی تہذیب کا سارا طلسم باطل کر دیا جائے۔

۵؎ یعنی چاشت کے وقت۔ اِس طرح کے موقعوں پر لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو جمع کرنا پیش نظر ہو تو یہی وقت موزوں ہوتا ہے۔

۶؎ قرآن کے دوسرے مقامات میں وضاحت ہے کہ فرعون نے اپنے اعیان و اکابر سے مشورہ کیا اور بالآخر یہ طے پایا کہ اِس معاملے کو معمولی نہ سمجھا جائے، بلکہ تمام ملک میں ہرکارے دوڑائے جائیں اور ماہر ترین جادوگروں کو بلا لیا جائے۔ آیت میں اُس کی اِنھی تدبیروں کو داؤ اکٹھے کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۷؎ فرعون اور اُس کی قوم کے لیے موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اصلاً یہی تھی کہ وہ اپنے مشرکانہ تصورات و عقائد سے دست بردار ہو کر خداے واحد کے سامنے سر جھکا دیں۔ لوگوں کے اجتماع سے فائدہ اٹھا کر اُنھوں نے سب سے پہلے اِسی کو پیش کیا ہے اور اِس کی یہ دلیل بھی واضح کر دی ہے کہ علم و عقل میں شرک کی کوئی بنیاد نہیں ہے، یہ سراسر افتراء علی اللہ ہے۔

۸؎ یہ اُس تاریخ کی طرف اشارہ ہے جس میں رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد یہ نامرادی بار بار

فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿۶۲﴾ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ
اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾ فَاَجْمِعُوْا
كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿۶۴﴾
قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿۶۵﴾ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا
فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿۶۶﴾ فَاَوْجَسَ

اِس پر وہ[۷۹] آپنے اُس معاملے میں باہم بحثا بحثی اور چپکے چپکے مشورے کرنے لگے۔ (بالآخر) اُنھوں نے کہا: یہ دونوں یقیناً بڑے ماہر جادوگر ہیں[۸۰]۔ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمھارے ملک سے نکال دیں اور تمھارے اِس مثالی طریق زندگی کا خاتمہ کر دیں[۸۱]۔ سو اپنی سب تدبیریں اکٹھی کر لو، پھر متحد ہو کر (اِن کے مقابلے میں) آؤ اور (اچھی طرح سمجھ لو کہ) آج وہی کامیاب رہے گا جو غلبہ پا لے گا۔ ۶۲-۶۴

جادوگر بولے: موسیٰ، یا تم پھینکو یا پھر یہ ہو کہ پہلے ہم ہی پھینکتے ہیں[۸۲]؟ موسیٰ نے کہا: نہیں، بلکہ تم ہی پھینکو[۸۳]۔ (اُنھوں نے پھینکا) تو یکایک اُن کی رسیاں اور لاٹھیاں اُن کے جادو کے زور سے اُس کو اِس سامنے آتی رہی۔

۷۹ یعنی تمام اعیان حکومت اور تمام ساحر جو مقابلے کا لائحۂ عمل طے کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے۔

۸۰ یہ بات، ظاہر ہے کہ جادوگروں کے اندر پیشہ ورانہ رقابت کا جذبہ بھڑکانے کے لیے کہی گئی ہے۔

۸۱ یہ اُس طرح کی بات ہے جو ارباب اقتدار جب عوام کو اپنے کسی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں تو بالعموم کہتے ہیں، ورنہ معلوم ہے کہ برتر طریق زندگی جس کا حوالہ دیا گیا ہے، یہ اُس وقت کی اشرافیہ ہی کے لیے تھا۔ فرعونی تہذیب میں عوام کی حیثیت غلاموں اور قلیوں سے زیادہ نہیں تھی۔

۸۲ یہ بات اُنھوں نے پیشہ ورانہ اخلاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہی، لیکن جملے کا اسلوب ایسا ہے کہ اُن کی یہ خواہش صاف ظاہر ہو رہی ہے کہ وہی پہل کرنا چاہتے ہیں تاکہ ابتدا ہی میں حاضرین کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیں۔ اِس طرح کے مقابلوں میں پہل کا موقع مل جائے تو اِس کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی ﴿۶۷﴾ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی ﴿۶۸﴾ وَاَلْقِ مَا
فِیْ یَمِیْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا اِنَّمَا صَنَعُوْا كَیْدُ سٰحِرٍ وَلَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ
اَتٰی ﴿۶۹﴾ فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰی ﴿۷۰﴾

طرح دکھائی دینے لگیں کہ گویا دوڑ رہی ہیں[۸۴]۔ اِس پر موسیٰ اپنے دل ہی دل میں کچھ ڈر ا[۸۵]۔ ہم نے کہا: ڈرو نہیں، یقیناً تم ہی غالب رہو گے اور اُس کو جو تمھارے ہاتھ میں ہے، (زمین پر) ڈال دو۔ اُنھوں نے جو کچھ بنایا ہے، یہ ابھی اُس کو نگل جائے گا۔ (اِس لیے کہ) جو کچھ اُنھوں نے بنایا ہے، یہ محض جادوگر کا فریب ہے اور جادوگر جہاں سے بھی آئے، (حق کے مقابل میں) وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا[۸۶]۔ آخر کو یہی ہوا کہ جادوگر سجدے میں گر پڑے[۸۷]۔ اُنھوں نے بے اختیار کہا: ہم موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لے آئے ہیں[۸۸]۔ ۶۵-۷۰

۸۳؎ موسیٰ علیہ السلام کو پورا اعتماد تھا کہ اُن کا پروردگار اُن کے ساتھ ہے، اِس لیے اُنھوں نے پہلے اُنھی کو موقع دیا کہ وہ اپنا ہنر دکھائیں۔ جادوگر جب اپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں تو جوے کے تیروں کی طرح کوئی چیز دیکھنے والوں کے سامنے پھینکتے اور اُس پر اپنا جادو دکھاتے ہیں۔ آیت میں 'اِلْقَاء'، یعنی پھینکنے کا لفظ اِسی مناسبت سے استعمال ہوا ہے۔

۸۴؎ موسیٰ علیہ السلام چونکہ لٹھیا کو سانپ بنا کر پیش کرتے تھے، اِس لیے جادوگروں نے بھی اُسی قسم کے جادو کا انتخاب کیا اور لاٹھیوں کے ساتھ ساتھ رسیوں کو بھی سانپ بنا کر دکھا دیا۔ لیکن قرآن نے 'یُخَیَّلُ اِلَیْهِ' کے الفاظ سے واضح کر دیا ہے کہ جادو سے کسی چیز کی حقیقت و ماہیت نہیں بدلتی۔ وہ محض نگاہ اور قوت متخیلہ کو متاثر کرتا ہے، جس سے انسان وہی کچھ دیکھنے لگتا ہے جو جادوگر دکھانا چاہتا ہے۔

۸۵؎ یہ ایک وقتی ہراس تھا جو اِس طرح کی صورت حال میں فطری طور پر پیدا ہو جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ غالباً توقع نہیں کر رہے تھے کہ جادوگر کوئی ایسی چیز پیش کر دیں گے جو اُسی طرح کی ہو گی، جیسی وہ پیش کر رہے تھے۔

۸۶؎ اِس لیے کہ حق کے سامنے آتے ہی ہر شخص پر واضح ہو جاتا ہے کہ جادو کیا ہے اور معجزہ کیا چیز ہوتی ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، یہ بالکل ویسی ہی بات ہے کہ ماہ نخشب کے مقابلے میں خورشید جہاں تاب نکل آئے۔ اِس

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ﴿۷۱﴾

(اِس پر) فرعون نے کہا: تم نے میری اجازت کے بغیر ہی اُس کی تصدیق کر دی ہے؟ یقیناً وہی تمھارا گرو ہے، جس نے تمھیں جادو سکھایا ہے۔ اچھا تو اب میں تمھارے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کٹواؤں گا اور تمھیں (سب کے سامنے) ضرور کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا۔ تمھیں خوب پتا چل جائے گا کہ ہم دونوں میں سے کس کی سزا زیادہ سخت اور زیادہ دیر تک رہنے والی ہے[۸۹]۔ ۷۱

کے بعد، ظاہر ہے کہ منطق واستدلال سے دونوں کا فرق واضح کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

۸۷؎ یعنی جب عصا پھینکا گیا اور اُس نے سانپ کی طرح لہراتی ہوئی ہر رسی اور ہر لاٹھی کو اُسی طرح رسی اور لاٹھی بنا دیا، جس طرح کہ وہ حقیقت میں تھی اور سارا طلسم نابود ہو گیا تو جادوگر سجدے میں گر پڑے۔ آیت میں اِس کے لیے 'اُلْقِیَ' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو مجہول کا صیغہ ہے۔ یہ جادوگروں کے جذبۂ تعظیم و اکرام کی تعبیر کے لیے آیا ہے۔ سحر و ساحری اور اِس طرح کے دوسرے علوم کو اُن کے ماہرین ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اُن میں اور معجزے میں فرق کے لیے یہ نہایت واضح معیار ہے کہ اِن علوم وفنون کے ماہرین بھی اُس کے سامنے اعتراف عجز پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

۸۸؎ یہ فرعون کی خدائی اور بادشاہی، دونوں کا صاف انکار تھا جسے، ظاہر ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

۸۹؎ یعنی میری یا تمھارے گرو موسیٰ کی۔ یہ اُس سزا کی طرف اشارہ ہے جو نفسی علوم کے ماہرین اپنے شاگردوں کی نافرمانی پر اُنھیں دیتے ہیں۔ اِس طرح کے لوگ بالعموم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اُنھوں نے گرو کی مرضی کے خلاف کچھ کیا تو اپنے جادو کے زور سے وہ اُنھیں کسی بڑی آفت میں مبتلا کر دے گا۔ اوپر جادوگروں کے جس اعتراف حق کا بیان ہے، اُس سے مجمع پر جو اثر پڑا اور فرعون اور اُس کے درباری جس طرح رسوا ہو کر رہ گئے، اُس کی خفت مٹانے اور بگڑے ہوئے حالات کو سنبھالنے کے لیے یہ فرعون نے فوراً اُن پر سازش کا الزام رکھ کر سزا سنا دی ہے کہ سب تمھاری

www.javedahmadghamidi.com

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ
قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿٧٢﴾ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَلَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ

جادوگروں نے جواب دیا: ہم اُن روشن نشانیوں پر ہرگز تم کو ترجیح نہ دیں گے جو ہمارے سامنے آ چکی ہیں اور نہ اُس ذات پر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ اِس لیے تمھیں جو کرنا ہے، کر گزرو[۹۰]۔ تم جو کچھ کر سکتے ہو، اِسی دنیا کی زندگی کا کر سکتے ہو۔ ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں، اِس لیے کہ وہ ہماری خطائیں معاف کر دے اور اُس جادو کو بھی معاف فرمائے جس پر

اور تمھارے گرو، موسیٰ کی ملی بھگت ہے۔ اُس نے ڈرا دھمکا کر تمھیں اپنے ساتھ ملا لیا ہے اور اب تم لوگ ہمارے خلاف بغاوت کرنا چاہتے ہو۔ تم نے یہ سب اِسی لیے کیا ہے کہ کھلے میدان میں اپنے گرو کے سامنے شکست مان لو گے تو اُس کی دھاک عام لوگوں پر بیٹھ جائے گی اور ہماری حکومت کے خلاف تمھاری سازش کامیاب ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ تم نے میری اجازت کا انتظار بھی نہیں کیا اور موسیٰ پر ایمان کا اعلان کر دیا ہے۔ اب میں تمھیں وہی سزا دوں گا جو سلطنت کے باغیوں کو دی جاتی ہے اور وہ اُس سزا سے کہیں زیادہ سخت اور عبرت انگیز ہو گی، جس کے خوف سے تم نے فتح و شکست کا یہ ڈراما رچایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...ہر چند یہ بات بالکل بے تکی تھی۔ فرعون خود اپنے ہی منتخب کیے ہوئے میدان میں خود اپنی ہی لائی ہوئی فوج سے ہارا تھا، لیکن اِس شکست کا اثر مٹانے کے لیے اُس کو کوئی نہ کوئی بات تو آخر بنانی تھی۔ چنانچہ اُس نے بنائی اور داد دینی چاہیے کہ اُس نے بڑی سیاسی ذہانت کا ثبوت دیا اور کیا عجب کہ اِس طرح وہ بہتوں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب بھی ہو گیا ہو، لیکن حق کو اِس قسم کی پرفریب باتوں سے نہیں دبایا جا سکتا۔“ (تدبر قرآن ۵/۶۷)

۹۰۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سچا ایمان آن کی آن میں انسان کو کس بلندی پر پہنچا دیتا ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، یہ وہی جادوگر ہیں جن کا حال قرآن میں دوسری جگہ یہ بیان ہوا ہے کہ جب وہ مقابلے کے لیے بلائے گئے تو اُنھوں نے بڑی لجاجت کے ساتھ فرعون سے اپنی کامیابی کی صورت میں انعام کی درخواست کی یا اب ایمان کے نور نے اُن کے دلوں کو اِس طرح منور کر دیا کہ خدا اور آخرت کے سوا اِس دنیا کی کسی چیز کی اُن کی نگاہوں میں کوئی وقعت باقی نہیں رہی ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے ایمان کی حفاظت کی راہ میں اپنی زندگی بھی قربان کرنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔

اَکۡرَهۡتَنَا عَلَیۡهِ مِنَ السِّحۡرِ وَاللّٰهُ خَیۡرٌ وَّاَبۡقٰی ﴿۷۳﴾

اِنَّهٗ مَنۡ یَّاۡتِ رَبَّهٗ مُجۡرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ لَا یَمُوۡتُ فِیۡهَا وَلَا یَحۡیٰی ﴿۷۴﴾ وَمَنۡ
یَّاۡتِهٖ مُؤۡمِنًا قَدۡ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الۡعُلٰی ﴿۷۵﴾ جَنّٰتُ عَدۡنٍ

تو نے ہمیں مجبور کیا ہے۔[91] اللہ ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے۔[92] ۷۳-۷۲

حقیقت[93] یہ ہے کہ جو شخص بھی مجرم بن کر اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہوگا، اُس کے لیے جہنم ہے، وہ اُس میں نہ مرے گا، نہ جیے گا۔[94] اِس کے برخلاف جو مومن ہو کر اُس کے حضور آئیں گے، جنھوں نے نیک عمل کیے ہوں گے[95] تو یہی لوگ ہیں جن کے لیے اونچے درجے ہیں۔ ہمیشہ رہنے

۹۱؎ اِس سے معلوم ہوا کہ مقابلے پر آنے سے پہلے ہی جادوگر کسی حد تک سمجھ چکے تھے کہ معاملہ اُن کے کسی ہم پیشہ سے نہیں ہے، بلکہ کسی اور ہی دنیا کے آدمی سے ہے۔ چنانچہ وہ طوعاً و کرہاً اپنے جادو کا کرتب دکھانے کے لیے تیار ہوئے۔

۹۲؎ یہ فرعون کی بات کا جواب ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ تمھیں پتا چل جائے گا کہ 'اَیُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبۡقٰی'۔ جادوگروں نے اُس کا نہایت صحیح اور بھرپور جواب دیا ہے کہ ہمیں ڈراتے ہو تو سن لو کہ ہم نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیا ہے اور 'اللّٰهُ خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی'۔

۹۳؎ یہاں سے آگے آیت ۷۶ تک تضمین ہے۔ انداز کلام صاف بتا رہا ہے کہ یہ عبارت جادوگروں کے قول کا حصہ نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی بات کے ساتھ اپنی بات ملا کر اُس کو پورا اور مطابق حال کر دیا ہے۔

۹۴؎ یہ عذاب دوزخ کی شدت، اُس کی ہمیشگی اور بے پناہی کی ایسی تعبیر ہے کہ الفاظ سے اُس کی شرح و وضاحت کا تقاضا کیا جائے تو اعتراف عجز کر لیتے ہیں۔ اِس سے جو تصویر سامنے آتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اُس سے روح کانپتی اور جسم پر لرزہ طاری ہوتا ہے۔

۹۵؎ اِس سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اُسی ایمان کا اعتبار ہے، جس کے ساتھ اچھا عمل بھی ہو۔ 'مُؤۡمِنًا قَدۡ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ' کا اسلوب اِسی مدعا پر دلالت کرتا ہے۔ قرآن جس دین کی دعوت دیتا ہے، اُس میں ایمان اور عمل لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ ایمان کے بغیر جس طرح اعمال بے نتیجہ ہیں، اُسی طرح اعمال صالحہ کے بغیر ایمان کی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا وَ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا مَنۡ تَزَکّٰی ﴿۷۶﴾
وَلَقَدۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِیۡ فَاضۡرِبۡ لَہُمۡ طَرِیۡقًا فِی الۡبَحۡرِ
یَبَسًا لَّا تَخٰفُ دَرَکًا وَّ لَا تَخۡشٰی ﴿۷۷﴾ فَاَتۡبَعَہُمۡ فِرۡعَوۡنُ بِجُنُوۡدِہٖ فَغَشِیَہُمۡ

والے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اُن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ صلہ ہے اُن کا جو پاکیزگی اختیار کریں۔[96] ۷۴-۷۶

(اِس کے بعد کچھ عرصہ گزرا، یہاں تک کہ حجت پوری ہوگئی، تب) ہم نے موسیٰ کو وحی بھیج دی کہ میرے بندوں کو رات میں لے کر نکل جاؤ۔[97] پھر دریا (سامنے آئے تو اپنے عصا سے اُس) میں اُن کے لیے ایک سوکھا راستہ بنا لو۔[98] (تم اطمینان سے پار ہو جاؤ گے)۔ تمھیں نہ کسی کے آ پکڑنے کا خطرہ ہوگا، نہ ڈوبنے کا اندیشہ۔[99] پھر جب وہ نکلے تو فرعون نے اپنی فوجوں کے ساتھ اُن کا پیچھا کیا۔ پھر اُس

بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، ایسا ایمان ایک ٹھونٹھ درخت کے مانند ہے جو برگ و بار سے بالکل خالی ہے۔ جس درخت نے دنیا میں اپنے برگ و بار پیدا نہیں کیے، آخر وہ آخرت میں کس طرح ثمربار ہو جائے گا!

۹۶؎ یہی دین کی تمام دعوت کا خلاصہ اور اُس کے نزول کا مقصد ہے۔ خدا کی جنت کے دروازے اُنھی لوگوں کے لیے کھلیں گے جو اپنے ظاہر و باطن کو ہر لحاظ سے پاکیزہ بنانے کی کوشش کریں۔

۹۷؎ یہ ہجرت کی ہدایت ہے۔ حضرت موسیٰ نے فرعون سے یہ مطالبہ ابتدا ہی میں کر دیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو اُن کے ساتھ جانے کی اجازت دے۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ فرعون اور اُس کی قوم پر اتمام حجت کے ساتھ وہ اِس لیے بھی مبعوث کیے گئے تھے کہ بنی اسرائیل اپنی قومی حیثیت میں شہادت حق کے جس منصب پر فائز کیے گئے ہیں، اُس کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے وہ اُنھیں اُس سرزمین میں لا کر آباد کریں، جس کے بارے میں فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ اُسے توحید کی دعوت کا مرکز بنایا جائے گا۔ چنانچہ ہجرت کی یہ ہدایت اصلاً تو اُنھی کے لیے ہے، لیکن تبعاً اِس میں وہ لوگ بھی شامل ہوں گے جو مصریوں میں سے ایمان لے آئے تھے۔

۹۸؎ اصل میں 'فَاضۡرِبۡ لَہُمۡ طَرِیۡقًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ عربی محاورے کے لحاظ سے 'ضرب طریق' کے معنی راستہ بنا لینے کے ہیں، لیکن اِس کے استعمال میں ایک لطیف کنایہ حضرت موسیٰ کے عصا کی طرف بھی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مِّنَ الْیَمِّ مَا غَشِیَهُمْ ﴿۷۸﴾ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰی ﴿۷۹﴾

کو اور اُس کی فوجوں کو دریا سے ڈھانپ لیا، جس چیز نے ڈھانپ لیا۔[۱۰۰] حقیقت یہ ہے کہ فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ ہی کیا تھا، (اُس کو) صحیح راہ نہیں دکھائی تھی۔ ۷۷-۷۹

ہے، جس کی ضرب ہی سے بحر احمر کی شمالی خلیج میں یہ راستہ بنایا گیا تھا۔ آیت میں 'اَلْبَحْر' کا الف لام اِس بات کا قرینہ ہے کہ حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے متعین طور پر بتا دیا تھا کہ اُنھیں کہاں سے نکلنا ہے۔ بائیبل کی کتاب خروج میں ہے:

''اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو کیوں مجھ سے فریاد کر رہا ہے؟ بنی اسرائیل سے کہہ کہ وہ آگے بڑھیں اور تو اپنی لاٹھی اٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اُس کو دو حصے کر اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل جائیں گے... پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اُسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا۔ اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور اُن کے دہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا۔'' (۱۴: ۱۵-۲۹)

۹۹؎ اصل الفاظ ہیں: 'لَا تَخٰفُ دَرَکًا وَّلَا تَخْشٰی'۔ اِن میں 'تَخْشٰی' کا مفعول عربیت کے قاعدے سے تقابل کے اصول پر حذف کر دیا گیا ہے، یعنی 'وَلَا تَخْشٰی غَرَقًا'۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۱۰۰؎ کسی چیز کی ہولناکی یا غیر معمولی عظمت و جلالت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ اسلوب قرآن میں کئی جگہ اختیار کیا گیا ہے۔ یہ اُس موقع پر اختیار کیا جاتا ہے، جب الفاظ تعبیر سے قاصر ہو جائیں۔ بائیبل کی کتاب خروج میں، یہ واقعہ اِس طرح بیان ہوا ہے:

''جب مصر کے بادشاہ کو خبر ملی کہ وہ لوگ چل دیے تو فرعون اور اُس کے خادموں کا دل اُن لوگوں کی طرف سے پھر گیا اور وہ کہنے لگے کہ یہ ہم نے کیا کیا کہ اسرائیلیوں کو اپنی خدمت سے چھٹی دے کر اُن کو جانے دیا۔ تب اُس نے اپنا رتھ تیار کروایا اور اپنی قوم کے لوگوں کو ساتھ لیا اور اُس نے چھ سو چنے ہوئے رتھ، بلکہ مصر کے سب رتھ لیے اور اُن سبھوں میں سرداروں کو بٹھایا... اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا تا کہ پانی مصریوں اور اُن کے رتھوں اور سواروں پر پھر بہنے لگے۔ اور موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور صبح ہوتے ہوتے سمندر پھر اپنی اصلی قوت پر آ گیا اور مصری اُلٹے بھاگنے لگے اور خداوند نے سمندر کے بیچ ہی میں مصریوں کو تہ و بالا کر دیا۔ اور پانی پلٹ کر آیا اور اُس نے رتھوں اور سواروں اور فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں گیا تھا، غرق کر دیا اور ایک بھی اُن میں سے باقی نہ چھوٹا۔'' (۱۴: ۵-۲۸)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ
وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ﴿۸۰﴾ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا
فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿۸۱﴾ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ
لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿۸۲﴾

اے بنی اسرائیل، ہم نے اِس طرح تمھارے اِس دشمن سے تم کو نجات دی تھی اور تم سے طور کے مقدس کنارے کا وعدہ ٹھیرایا[101] اور تم پر من و سلویٰ اتارا تھا[102]، (اِس ہدایت کے ساتھ کہ) ہماری دی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اُن کے معاملے میں سرکشی نہ کرو[103] کہ تم پر میرا غضب نازل ہو جائے اور (یاد رکھو کہ) جس پر میرا غضب نازل ہوا، وہ پھر گر کے رہا[104]۔ البتہ، جو توبہ کریں اور ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں، پھر ہدایت پر رہیں تو اُن کے لیے میں بہت زیادہ بخشنے والا ہوں۔ ۸۰-۸۲

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۰۱؎ یہ اُس وعدے کی طرف اشارہ ہے جو دریا پار کر لینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنی شریعت دینے کے لیے فرمایا۔ قرآن نے دوسری جگہ اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ بنی اسرائیل اِس کے لیے طور کے اُسی مقدس جانب بلائے گئے تھے، جہاں حضرت موسیٰ کو نبوت عطا ہوئی۔ بائیبل میں ہے:

> ''اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ پہاڑ پر میرے پاس آ اور وہیں ٹھیرا رہ اور میں تجھے پتھر کی لوحیں اور شریعت اور احکام جو میں نے لکھے ہیں، دوں گا تاکہ تو اُن کو سکھائے۔ اور موسیٰ اور اُس کا خادم یشوع اٹھے اور موسیٰ خدا کے پہاڑ کے اوپر گیا۔ اور بزرگوں سے کہہ گیا کہ جب تک ہم لوٹ کر تمھارے پاس نہ آ جائیں، تم ہمارے لیے یہیں ٹھیرے رہو اور دیکھو ہارون اور حور تمھارے ساتھ ہیں۔ جس کسی کا مقدمہ ہو، وہ اُن کے پاس جائے۔''

(خروج ۲۴: ۱۲-۱۴)

۱۰۲؎ یہ من و سلویٰ کیا ہے؟ اِس کی وضاحت ہم سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۵۷ کے تحت کر چکے ہیں۔

۱۰۳؎ یعنی اُن کو پا کر اُن کا جو حق تم پر عائد ہوتا ہے، اُس کو ادا کرنے میں سرکشی کا رویہ اختیار نہ کرو، بلکہ خدا کے شکر گزار بن کر رہو کہ اُس نے یہ چیزیں اِن حالات میں اور اِس فراوانی کے ساتھ تمھیں عطا فرمائی ہیں۔

۱۰۴؎ یعنی اپنے اُس مقام سے گر کر رہا جو اُس کو میں نے عطا فرمایا تھا۔

وَمَآ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ يٰمُوۡسٰى ﴿۸۳﴾ قَالَ هُمۡ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِىۡ وَعَجِلۡتُ
اِلَيۡكَ رَبِّ لِتَرۡضٰى ﴿۸۴﴾ قَالَ فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ مِنۡۢ بَعۡدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ ﴿۸۵﴾

(پھر ہوا یہ کہ موسیٰ اُس وعدے کے لیے وقت سے پہلے ہی پہنچ گیا، فرمایا): یہ اپنی قوم کو چھوڑ کر تم جلدی کیوں چلے آئے ہو، موسیٰ؟[۱۰۵] اُس نے عرض کیا: وہ لوگ بھی یہ میرے پیچھے ہی ہیں[۱۰۶] اور پروردگار، میں تیری خوشنودی کے لیے تیرے حضور جلدی چلا آیا ہوں[۱۰۷]۔ فرمایا: اچھا یہ بات ہے تو سن لو کہ ہم نے تمھاری قوم کو تمھارے پیچھے فتنے میں ڈال دیا[۱۰۸] اور سامری[۱۰۹] نے اُن کو گمراہ کر ڈالا ہے۔

۱۰۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَمَآ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ'۔ اِن میں 'اَعۡجَلَكَ' کے بعد 'عَنۡ' اِس بات کا قرینہ ہے کہ یہ چھوڑ کر آنے کے مفہوم میں کسی فعل پر متضمن ہو گیا ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۱۰۶؎ مطلب یہ ہے کہ آپ ہی کی جانب آ رہے ہیں کہ آپ کی شریعت سے بہرہ یاب ہوں۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے اپنی قوم پر اعتماد کا اظہار ہے کہ وہ کہیں نہیں جائیں گے، وہیں پہنچیں گے، جہاں اُن کو پہنچنے کے لیے کہا گیا ہے۔

۱۰۷؎ یعنی فرط شوق میں جلدی چلا آیا ہوں کہ آپ سے ہم کلام ہوں اور آپ بھی خوش ہوں کہ بندہ میری محبت میں اور میری شریعت کو جلد سے جلد پا لینے کے لیے وقت سے پہلے ہی حاضر ہو گیا ہے۔

۱۰۸؎ مطلب یہ ہے کہ اپنی سنت کے مطابق اُس کو چھوڑ دیا ہے کہ فتنے میں پڑ جائے۔ اِس سے تم پر واضح ہو جائے گا کہ میری محبت اور مجھ سے ملاقات کا شوق بھی اِس کا باعث نہیں بننا چاہیے کہ تم اپنی قوم سے غافل ہو جاؤ۔ تمھاری اصل ذمہ داری اِس قوم کی تعلیم و تربیت ہے تاکہ یہ اُس کام کے لیے تیار ہو جائے، جس کے لیے میں اِس کو مصر سے نکال کر لایا ہوں۔ تم اِس بات سے واقف تھے کہ اِس قوم کے عوام مشرکانہ عقائد سے متاثر ہیں اور تمھیں یہ بھی معلوم تھا کہ ہارون اِن بگڑے ہوئے لوگوں کو قابو میں نہیں رکھ سکیں گے، مگر اِس کے باوجود تم نے جلدی کی اور اُن کو اچھی طرح قاعدے میں لانے سے پہلے ہی یہاں چلے آئے ہو۔ یہ ایک غلطی تھی اور اِس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ ایک ایسے فتنے میں مبتلا ہو گئے ہیں، جس سے نمٹنا آسان نہیں ہو گا۔

۱۰۹؎ یہ اُس شخص کا نام نہیں ہے، بلکہ کسی قبیلے یا نسل یا مقام کی طرف نسبت ہے۔ ہم پیچھے ذکر کر چکے ہیں کہ مصریوں میں سے بھی کچھ لوگ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے اور ہجرت کے اِس سفر میں بنی اسرائیل کے ساتھ شریک

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

فَرَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ﴿۸۶﴾

قَالُوْا مَاۤ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَاۤ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿۸۷﴾

اِس پر موسیٰ سخت غصے اور افسوس کی حالت میں اپنی قوم کی طرف پلٹا۔ اُس نے (جا کر) اُن سے کہا: میری قوم کے لوگو، کیا تمھارے پروردگار نے تم سے نہایت اچھا وعدہ[۱۱۰] نہیں کیا تھا؟ پھر کیا تم پر زیادہ وقت گزر گیا یا تم نے یہ چاہا کہ تم پر تمھارے پروردگار کا غضب نازل ہو، اِس لیے تم نے میرے عہد[۱۱۱] کی خلاف ورزی کر ڈالی ہے؟ ۸۳-۸۶

اُنھوں نے جواب دیا: ہم نے آپ کے ساتھ وعدے کی خلاف ورزی کچھ اپنے اختیار سے نہیں کی ہے، بلکہ ہوا یہ کہ ہم سے لوگوں کے زیورات کا بوجھ اٹھوایا گیا تھا۔ پھر (اُن کے مطالبے پر) وہ ہم نے اتار پھینکا اور اِس طرح سامری نے یہ ہنر دکھایا ہے[۱۱۲]۔ ۸۷

تھے۔ یہ غالباً اُنھی میں سے کوئی فتین اور کیاد متصوف تھا، جس نے موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر بنی اسرائیل کے سادہ لوح عوام کو اپنے گرد جمع کر لینے کی کوشش کی اور اِس کے لیے اُسی طرح کا ڈھونگ رچایا، جس طرح کے ڈھونگ اِس قبیل کے لوگ رچایا کرتے ہیں۔

۱۱۰؎ یعنی اپنی شریعت اور اپنا ہدایت نامہ عطا فرمانے کا وعدہ۔

۱۱۱؎ یہ خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن روے سخن قوم کے سرداروں کی طرف ہے۔ لہٰذا یہ اُسی عہد کی طرف اشارہ ہے، جس کا حوالہ ہم پیچھے نقل کر آئے ہیں کہ طور پر جاتے وقت قوم کے سرداروں کو حضرت موسیٰ نے پابند کر دیا تھا کہ جب تک وہ اُن کے لیے خدا کی شریعت لے کر واپس نہیں آ جاتے، وہ لوگوں کو ادھر ادھر نہیں ہونے دیں گے اور تمام معاملات میں ہارون علیہ السلام کی ہدایات کی پیروی کریں گے۔

۱۱۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'اَلْقَى السَّامِرِيُّ'۔ اِن میں لفظ 'اَلْقٰى' بالکل اُسی مفہوم میں ہے، جس میں یہ پیچھے اِسی سورہ

فَاَخۡرَجَ لَهُمۡ عِجۡلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوۡا هٰذَاۤ اِلٰهُكُمۡ وَاِلٰهُ مُوۡسٰى فَنَسِىَ ﴿۸۸﴾
اَفَلَا يَرَوۡنَ اَلَّا يَرۡجِعُ اِلَيۡهِمۡ قَوۡلًا وَّلَا يَمۡلِكُ لَهُمۡ ضَرًّا وَّلَا نَفۡعًا ﴿۸۹﴾

سو[۱۱۳] (اُنھی کے زیورات سے) سامری نے اُن کے لیے ایک بچھڑا (بنا کر) نکال کھڑا کیا، ایک دھڑ جس سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔[۱۱۴] اِس پر وہ کہنے لگے کہ یہی تمھارا معبود ہے اور یہی موسیٰ کا معبود ہے، مگر وہ اُسے بھول گیا ہے۔[۱۱۵] (اُن پر افسوس)، پھر کیا وہ دیکھتے نہیں تھے کہ وہ نہ اُن کی کسی بات کا جواب دے سکتا ہے اور نہ اُن کو کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے؟ ۸۸-۸۹

کی آیت ۶۵ میں آیا ہے، یعنی پانسا پھینکنے اور کوئی ہنر یا کرتب دکھانے کے مفہوم میں۔ مطلب یہ ہے کہ سفر کی آپادھاپی میں ضائع ہو جانے کے خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے لوگوں نے اپنے زیورات ہماری امانت میں رکھ دیے تھے۔ ہم اُنھیں ایک بوجھ ہی سمجھ کر اٹھائے ہوئے تھے۔ لوگ ہمارے پاس آئے اور اُنھوں نے اپنے زیورات مانگے تو ہم نے یہ بوجھ اتار پھینکا۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ ایک ذمہ داری تھی، اچھا ہوا کہ لوگوں نے ہمارے سر سے اتار دی، مگر وہ اُنھیں اکٹھا کر کے سامری کے پاس لے گئے اور اُس نے یہ کرتب دکھا دیا۔ اِس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہمیں تو معلوم بھی نہیں تھا کہ لوگ اپنے زیورات کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں، اِس لیے ہمارے متعلق یہ گمان نہ فرمائیے کہ ہم نے زیورات واپس کیے ہیں تو سامری کی اِس فتنہ پردازی میں ہمارا بھی کوئی دخل ہے۔

۱۱۳؎ قوم کے سرداروں کا جواب اوپر ختم ہو گیا۔ یہاں سے آگے انداز کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ واقعے کی تفصیل اللہ تعالیٰ خود بتا رہا ہے۔

۱۱۴؎ اُس زمانے کے مصر میں بت گری کا فن جس درجے کو پہنچا ہوا تھا، اُس سے واقف کسی شخص کے لیے ایک ایسا بچھڑا ڈھال لینا کچھ مشکل نہ تھا، جس میں سے اُس کے ڈکرانے کی آواز نکلتی ہو۔ چنانچہ اِس بچھڑے کی مورت بناتے وقت یہ صنعت گری بھی کی گئی تھی کہ اُس میں سے جب ہوا گزرتی تو جس طرح بچھڑے ڈکراتے ہیں، اُسی طرح کی آواز اُس سے نکلتی تھی۔ یہود کی بدقسمتی ہے کہ اُنھوں نے جس طرح زیورات کے بارے میں یہ روایت گھڑ لی کہ وہ اُنھوں نے قبطیوں کو دھوکا دے کر اُن سے لوٹ لیے تھے اور اِس کی ہدایت اُنھیں اللہ کے نبی نے اور خود نبی کو اللہ تعالیٰ نے دی تھی، اُسی طرح بچھڑا بنانے کا الزام بھی اپنے پیغمبر حضرت ہارون پر رکھ دیا ہے۔* قرآن نے یہ

---

* خروج ۳: ۱۴-۲۲۔ ۱۱: ۲-۳۔ ۱۲: ۳۵-۳۶۔ ۳۲: ۱-۵۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ
وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿٩٠﴾ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ﴿٩١﴾
قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿٩٢﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿٩٣﴾

ہارون اِس سے پہلے ہی اُن سے کہہ چکا تھا کہ میری قوم کے لوگو، تم اِس بچھڑے کے ذریعے سے فتنے میں ڈال دیے گئے ہو۔ تمھارا پروردگار تو حقیقت میں خداے رحمٰن ہے۔ سو تم میری پیروی کرو اور میری بات مانو۔[۱۱۶] مگر اُنھوں نے کہہ دیا کہ ہم تو اِسی بچھڑے کی پرستش میں لگے رہیں گے، جب تک موسیٰ لوٹ کر ہمارے پاس نہ آ جائے۔[۱۱۷] ۹۰-۹۱

(سو قوم کے سرداروں سے پوچھنے کے بعد) موسیٰ (ہارون کی طرف پلٹا اور) بولا: ہارون، جب تم نے دیکھا کہ یہ گمراہ ہوئے جا رہے ہیں تو تمھارا ہاتھ کس چیز نے پکڑ لیا تھا کہ تم میری پیروی نہ

---

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

دونوں ہی باتوں کی تردید کردی ہے۔

۱۱۵؎ یعنی طور پر جا کر اُسے فراموش کر بیٹھا ہے، ورنہ اُسے بھی معلوم ہے کہ اُس کا الٰہ در حقیقت یہی ہے۔

۱۱۶؎ یہ قرآن نے مزید واضح کر دیا ہے کہ بچھڑا بنانے کے گناہ عظیم میں حضرت ہارون کا ہرگز کوئی دخل نہ تھا، بلکہ اُنھوں نے تو ابتدا ہی سے اپنی قوم کے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ بائیبل اِس معاملے میں اپنی غلط بیانی کا راز خود ہی فاش کر دیتی ہے۔ اُس کا اپنا بیان ہے کہ اِس جرم کے مرتکبین کے بارے میں خدا کا حکم تھا کہ اُنھیں قتل کر دیا جائے گا اور اُن کے نام خدا کی کتاب سے مٹا دیے جائیں گے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب اِس جرم کی پاداش میں لوگوں کو سزا دی گئی تو نہ ہارون علیہ السلام کا نام کتاب سے مٹایا گیا اور نہ اُنھیں قتل کیا گیا، بلکہ خود بائیبل کی روایت کے مطابق اُن کو اور اُن کی اولاد کو بنی اسرائیل میں بزرگ ترین منصب، یعنی بنی لاوی کی سرداری اور مقدس کی کہانت سے سرفراز کر دیا گیا۔*

۱۱۷؎ اِس جملے سے مترشح ہے کہ حضرت ہارون کے سمجھانے سے لوگوں کو کسی حد تک اپنی حماقت کا احساس ہو گیا تھا، لیکن ہر حماقت کی طرح اب اِس حماقت سے بھی پیچھا چھڑانا آسان نہیں تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے معاملے کو موسیٰ

---

* خروج ۳۲: ۲۷-۳۳۔ گنتی ۱۸: ۱-۷۔

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾

کرو[۱۱۸]؟ پھر کیا تم نے میرے حکم کی نافرمانی کر ڈالی[۱۱۹]؟ ہارون نے جواب دیا: اے میری ماں کے جنے، نہ میری ڈاڑھی پکڑو، نہ میرا سر[۱۲۰]۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ تم (آ کر) کہو گے کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا لحاظ نہیں کیا ہے[۱۲۱]۔ ۹۲-۹۴

علیہ السلام کی واپسی تک ٹال دیا۔

۱۱۸؎ یعنی کس چیز نے روکا کہ اِس طرح کے موقعوں پر جو میرا طریقہ رہا ہے اور جس کی میں تمھیں ہدایت کرتا رہا ہوں، اُس پر عمل نہ کرو؟ یہ سوال کسی بدگمانی کی بنا پر نہیں، بلکہ حضرت ہارون کا عذر معلوم کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ آیت میں اِس کے لیے 'اَلَّا تَتَّبِعَنِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'لَا' ہمارے نزدیک زائد نہیں ہے، بلکہ زبان کے معروف قاعدے کے مطابق فعل کی تاکید کے لیے آیا ہے۔ یہ اسلوب ہماری زبان میں بھی موجود ہے۔

۱۱۹؎ یہ اُس حکم کی طرف اشارہ ہے جو طور پر جاتے وقت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون کو دیا تھا۔ سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۱۴۲ میں ہے کہ اُنھوں نے ہارون علیہ السلام کو ہدایت فرمائی تھی کہ میرے پیچھے تم میری قوم میں میری جانشینی کرو گے اور لوگوں کی اصلاح کرتے رہو گے اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کے طریقے پر نہیں چلو گے۔

۱۲۰؎ دوسری جگہ ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اِس موقع پر جوش حمیت اور غلبۂ حال میں تورات کی الواح ایک طرف پھینک دی تھیں اور حضرت ہارون کے بال پکڑ کر اُنھیں جھنجھوڑنے لگے تھے کہ اصل ذمہ داری تمھاری تھی، تم نے اِس فتنے کو کیوں سر اٹھانے دیا۔ ہارون علیہ السلام نے یہ بات اِسی موقع پر کہی ہے۔

۱۲۱؎ سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۱۵۰ میں صراحت ہے کہ حضرت ہارون نے لوگوں کو اِس فتنے سے روکنے کی انتہائی کوشش کی تھی، مگر اُنھوں نے آں جناب کے خلاف فساد کھڑا کر دیا اور آپ کو مار ڈالنے پر تل گئے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اب دو ہی صورتیں باقی رہ گئیں تھیں: یا تو حضرت ہارون اپنے ساتھیوں کو لے کر الگ ہو جائیں یا چند دن حضرت موسیٰ کی واپسی کا انتظار کریں۔ پہلی صورت میں اندیشہ تفریق ملت اور باہمی کشت وخون کا تھا۔ دوسری صورت میں توقع تھی کہ حضرت موسیٰ اپنے دبدبہ اور حسن تدبیر سے حالات پر قابو پا لیں گے۔ اِسی توقع کی بنا پر

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿٩٥﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ
قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿٩٦﴾ قَالَ فَاذْهَبْ
فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ وَانْظُرْ

موسیٰ نے کہا: اور سامری، تیرا کیا معاملہ ہے؟ اُس نے جواب دیا: میں نے وہ چیز دیکھی جو دوسروں نے نہیں دیکھی تو (اُسی کے مطابق) میں نے فرستادۂ الٰہی کے نقش قدم سے ایک مٹھی خاک اٹھالی، پھر اُس کو بچھڑے میں ڈال دیا۔[122] میرے نفس نے مجھے کچھ ایسا ہی سجھایا تھا۔[123] موسیٰ نے کہا: یہ بات ہے تو دور ہو، اب زندگی بھر تجھے یہی کہنا ہے کہ مجھے کوئی چھوئے نہیں[124] اور (مرنے کے بعد) تیرے لیے وعدے کا ایک وقت اور بھی ہے جو تجھ سے کسی طرح ٹلے گا نہیں۔ اور اپنے

اُنھوں نے پہلی صورت اختیار نہ کی کہ اُس سے اصلاح کی جگہ فساد کا اندیشہ تھا اور وہ حتی الامکان اِس فساد سے قوم کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۸۰)

۱۲۲؎ یہ سامری نے اپنے آپ کو معذور ٹھیرانے کے لیے بات بنائی ہے کہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں، یہ سب میں نے اپنے ایک کشف کے زیر اثر کیا ہے۔ مجھے ایک مشاہدہ ہوا تھا جو دوسروں کو نہیں ہوا۔ میں نے دیکھا کہ جبریل امین آئے ہیں اور میں نے اُن کے نقش قدم سے ایک مٹھی خاک اٹھالی ہے اور ایک بچھڑا بنا کر اُس کے اندر ڈال دی ہے، جس سے وہ بولنے لگا ہے۔ چنانچہ کشف میں جہاں سے مٹی اٹھائی تھی، وہیں سے اٹھا کر میں نے اِس بچھڑے میں ڈال دی۔ میں نے یہ سب بطور خود اور کسی شرارت کے ارادے سے نہیں کیا ہے۔

۱۲۳؎ یہ سامری کا اعتراف جرم ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اُسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اب حضرت موسیٰ کی گرفت سے اُس کے لیے چھوٹنا آسان نہیں ہے اور اِس قسم کی دھونس اُن کے آگے چلنے والی نہیں ہے، اِس وجہ سے اُس نے یہ اعتراف بھی کر لیا کہ یہ جو کچھ ہوا، محض مغالطے کا نتیجہ ہے کہ میں اپنے نفس کے ایک فریب کو کشف سمجھ بیٹھا اور مجھ سے یہ جرم صادر ہو گیا۔''

(تدبر قرآن ۵/ ۸۱)

۱۲۴؎ سامری جس اخلاقی کوڑھ میں مبتلا تھا، اُس کی سزا اُسے یہ دی گئی کہ اُسے جسمانی کوڑھ میں مبتلا کر دیا گیا۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں جو قاعدہ کوڑھیوں کی چھوت سے لوگوں کو بچانے کے لیے مقرر کیا گیا تھا، وہ اُس

اِلٰۤی اِلٰهِكَ الَّذِیۡ ظَلۡتَ عَلَیۡهِ عَاكِفًا لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنۡسِفَنَّهٗ فِی الۡیَمِّ نَسۡفًا ﴿۹۷﴾
اِنَّمَاۤ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِیۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَیۡءٍ عِلۡمًا ﴿۹۸﴾

اُس معبود کو دیکھ جس پر تو لگا بیٹھا تھا۔ ہمارا فیصلہ ہے کہ ہم ابھی اُس کو جلا دیں گے، پھر دریا میں بکھیر کر بہا دیں گے۔ (لوگو)، تمھارا معبود تو صرف اللہ ہے، جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اُس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔[۱۲۵] ۹۵-۹۸

پر بھی نافذ ہو گیا کہ اب وہ زندگی بھر اپنی زبان سے یہ منادی کرتا پھرے گا کہ لوگو، میں ناپاک ہوں، مجھے کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ یہ، ظاہر ہے کہ ذلت و رذالت کی آخری حد تھی، جس سے آگے کسی حد کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ بائیبل کی کتاب احبار میں یہ قاعدہ اِس طرح بیان ہوا ہے:

> ''اور جو کوڑھی اِس بلا میں مبتلا ہو، اُس کے کپڑے پھٹے اور اُس کے سر کے بال بکھرے رہیں اور وہ اپنے اوپر کے ہونٹ کو ڈھانکے اور چلا چلا کر کہے ناپاک ناپاک۔ جتنے دنوں تک وہ اِس بلا میں مبتلا رہے، وہ ناپاک رہے گا اور وہ ہے بھی ناپاک۔ پس وہ اکیلا رہا کرے۔ اُس کا مکان لشکر گاہ کے باہر ہو۔'' (۱۳: ۴۵-۴۶)

۱۲۵؎ یہ توحید کی دلیل ہے کہ جب خدا کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے تو اُس کو یہ احتیاج کیوں لاحق ہو گی کہ وہ کسی کو اپنا شریک بنائے؟

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دین و دانش

مولانا امین احسن اصلاحی

آفات روزہ اور ان کا علاج

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

روزے کی برکات میں سے یہ چند برکات ہم نے بیان کی ہیں، لیکن یہ برکتیں اس صورت میں ظاہر ہوتی ہیں، جب آدمی اپنے روزے کو ان تمام آفتوں سے محفوظ رکھ سکے جو روزے کو خراب کر دینے والی ہیں۔ یہ آفتیں چھوٹی اور بڑی بہت سی ہیں۔ ہم تزکیۂ نفس کے طالبوں کی واقفیت کے لیے یہاں چند بڑی آفتوں کا ذکر کریں گے اور ساتھ ہی ان کے وہ علاج بھی بتائیں گے جو قرآن اور حدیث میں بیان ہوئے ہیں تاکہ جو لوگ اپنے روزوں کی حفاظت کرنا چاہیں، ان سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔

لذتوں اور چٹخاروں کا شوق

روزے کی عبادت، جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے، اس لیے مقرر کی گئی ہے کہ آدمی اپنی خواہشوں پر قابو پا سکے۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے، جب آدمی اس مقصد کو روزوں میں ملحوظ رکھے اور ان رغبتوں کو حتی الامکان دبائے جن کے آگے اپنی روزمرہ زندگی میں وہ اکثر بے بس ہو جایا کرتا ہے اور یہ بے بسی اس کو بہت سی اخلاقی اور شرعی کم زوریوں میں مبتلا کر دیتی ہے، لیکن بہت سے لوگ اس مقصد کو بالکل ملحوظ نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک روزے کا مہینا خاص کھانے پینے کا مہینا ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اس مہینے میں کھانے پینے پر جتنا بھی

خرچ کیا جائے، خدا کے ہاں اس کا کوئی حساب نہیں ہوگا۔ اس خیال کے لوگ اگر ـــــ خوش قسمتی سے ـــــ کچھ خوش حال بھی ہوتے ہیں تو پھر تو فی الواقع ان کے لیے روزوں کا مہینا کام و دہن کی لذتوں سے متمتع ہونے کا موسم بہار ہی بن کے آتا ہے۔ وہ روزے کی پیدا کی ہوئی بھوک اور پیاس کو نفس کشی کے بجاے نفس پروری کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ وہ صبح سے لے کر شام تک طرح طرح کے پکوانوں کے پروگرام بنانے اور ان کے تیار کرانے میں اپنے وقت صرف کرتے ہیں اور افطار سے لے کر سحر تک اپنی زبان اور اپنے پیٹ کی تواضع میں اپنا وقت گزارتے ہیں۔ میں ایک ایسے بزرگ سے واقف ہوں جو ایک دین دار آدمی تھے، لیکن ان کا نظریہ یہ تھا کہ رمضان کا مہینا کھانے پینے کا خاص مہینا ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کے تحت وہ رمضان کے مہینے کے لیے کھانے پینے کی مختلف چیزوں کا اہتمام بہت پہلے سے شروع کر دیتے تا کہ رمضان میں ان کی تنوعات سے متمتع ہو سکیں۔

ہر شخص جانتا ہے کہ روزہ کھانے پینے کے شوق کو اکسا دیتا ہے۔ لیکن روزے کا مقصود اسی اکساہٹ کو دبانا ہے، نہ کہ اس کی پرورش کرنا، اس وجہ سے صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی قوت کار کو باقی رکھنے کے لیے کھائے پیے تو ضرور، لیکن ہرگز ہرگز کھانے پینے کو اپنی زندگی کا موضوع نہ بنا لے۔ جو کچھ بغیر کسی خاص سرگرمی اور بغیر کسی خاص اہتمام کے میسر آ جائے، اس کو صبر و شکر کے ساتھ کھا لے۔ اگر کوئی چیز پسند کے خلاف سامنے آئے تو اس پر بھی گھر والوں پر غصہ کا اظہار نہ کرے۔ اگر کسی کو خدا نے فراغت و خوش حالی دی ہو تو اسے چاہیے کہ وہ خود اپنے کھانے پینے پر اسراف کرنے کے بجاے غریب اور مسکین روزہ داروں کی مدد اور ان کو کھلانے پلانے پر خرچ کرے۔ اس چیز سے اس کے روزے کی روحانیت اور برکت میں بڑا اضافہ ہوگا۔ رمضان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فیاضی کا جو حال ہوتا تھا، اس کے متعلق ایک حدیث اوپر گزر چکی ہے۔ روزہ افطار کرانے کے ثواب سے متعلق ایک حدیث ملاحظہ ہو:

حضرت زید بن خالد جہنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ:

من فطّر صائمًا كان له مثل أجره غير أنّه لاينقص من أجر الصائم شيئًا. (ترمذی، رقم ۸۰۷)

''جس نے کسی روزہ دار کو افطار کرایا، اس کے لیے روزہ دار کے برابر اجر ہے۔ اور اس سے روزہ دار کے اجر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔''

اشتعال طبیعت

آدمی جب بھوکا پیاسا ہو تو قاعدہ ہے کہ اس کا غصہ بڑھ جایا کرتا ہے۔ جہاں کوئی بات ذرا بھی اس کے مزاج کے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

خلاف ہوئی فوراً اس کو غصہ آ جاتا ہے۔ روزے کے مقاصد میں سے یہ چیز بھی ہے کہ جن کی طبیعتوں میں غصہ زیادہ ہو، وہ روزے کے ذریعے سے اپنی طبیعتوں کی اصلاح کریں۔ لیکن یہ اصلاح اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب آدمی روزے کو اپنی طبیعت کی اس خرابی کی اصلاح کا ذریعہ بنائے۔ اگر وہ اس کو اپنی طبیعت کی اصلاح کا ذریعہ نہ بنائے تو اس بات کا بڑا اندیشہ ہے کہ روزہ اس پہلو سے اس کے لیے مفید ہونے کے بجائے الٹا مضر ہو جائے، یعنی اس کی طبیعت کا اشتعال کچھ اور زیادہ ترقی کر جائے۔ جو شخص اس کو اپنی اصلاح کا ذریعہ بنانا چاہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ جب اس کی طبیعت میں اشتعال پیدا ہو یا کوئی دوسرا اس کے اندر اس اشتعال کو پیدا کرنے کی کوشش کرے تو وہ فوراً اس بات کو یاد کرے کہ 'أَنَا صَائِمٌ' (میں روزے سے ہوں)، اور یہ چیز روزے کے مقصد کے بالکل منافی ہے۔ یہ طریقہ اختیار کرنے سے آدمی کو غصہ پر قابو پانے کی تربیت ملتی ہے اور آہستہ آہستہ یہ تربیت اس کے مزاج کو بالکل بدل دیتی ہے، یہاں تک کہ اس کو اپنے غصہ پر اس حد تک قابو حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کو وہ وہیں استعمال کرتا ہے، جہاں وہ اس کو استعمال کرنا چاہتا ہے۔

لیکن بہت سے لوگ اسلام کے بتائے ہوئے اس اصول کے بالکل خلاف روزے کو سپر کے بجائے تلوار کے طور پر استعمال کرنے کے عادی بن جاتے ہیں، یعنی روزہ ان کے لیے ضبط نفس کے بجائے اشتعال نفس کا بہانہ بن جایا کرتا ہے۔ وہ بیوی پر، بچوں پر، نوکروں پر اور ماتحتوں پر ذرا ذرا سی بات پر برس پڑتے ہیں، صلواتیں سناتے ہیں، گالیاں بکتے ہیں اور بعض حالات میں مار پیٹ سے بھی دریغ نہیں کرتے اور پھر اپنے آپ کو اس خیال سے تسلی دے لیتے ہیں کہ کیا کریں، روزے میں ایسا ہو ہی جایا کرتا ہے۔

جو لوگ اپنے نفس کو اس راہ پر ڈال دیتے ہیں، ان کے لیے روزہ اصلاح نفس کا ذریعہ بننے کے بجائے ان کے بگڑے ہوئے نفس کو بگاڑنے کا مزید سبب بن جایا کرتا ہے۔ جو روزہ بھی وہ رکھتے ہیں، وہ ان کے نفس مشتعل کے لیے چابک کا کام دیتا ہے جس سے ان کا نفس تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے۔ جو شخص روزے کی برکتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، اسے چاہیے کہ وہ روزے کو اپنے نفس کے لیے ایک لگام کے طور پر استعمال کرے اور ہر اشتعال دلانے والی بات کو اسی سپر پر روکے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ تجربہ گواہی دیتا ہے کہ اگر روزے کے احترام کا یہ احساس طبیعت پر غالب رہے تو آدمی بڑی سے بڑی ناگوار بات بھی برداشت کر جاتا ہے اور اس پر کوئی احساس کم تری طاری نہیں ہوتا، بلکہ اس طرح کی آزمایش کے جتنے مواقع اس کے سامنے آتے ہیں، وہ ہر موقع پر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے شیطان

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پر ایک فتح حاصل کی ہے اور اس فتح کا احساس اس کے غصہ کو ایک راحت و اطمینان کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے۔

دل بہلانے والی چیزوں کی رغبت

روزے کی ایک عام آفت یہ بھی ہے کہ بہت سے لوگ، جن کے ذہن کی تربیت نہیں ہوئی ہوتی ہے، کھانے پینے اور زندگی کی بعض دوسری دل چسپیوں سے علیحدگی کو ایک محرومی سمجھتے ہیں اور اس محرومی کے سبب سے ان کے لیے دن کاٹنے مشکل ہو جاتے ہیں۔ اس مشکل کا حل وہ یہ پیدا کرتے ہیں کہ بعض ایسی دل چسپیاں تلاش کر لیتے ہیں جو ان کے خیال میں روزے کے مقصد کے منافی نہیں ہوتیں۔ مثلاً یہ کہ تاش کھیلتے ہیں، ناول، ڈرامے اور افسانے پڑھتے ہیں، ریڈیو پر گانے سنتے ہیں، دوستوں میں بیٹھ کر گپیں ہانکتے ہیں اور بعض من چلے سینما کا ایک آدھ شو دیکھ آنے میں بھی کوئی قباحت نہیں خیال کرتے۔

ان سے زیادہ سہل الحصول دل چسپی بعض لوگ یہ پیدا کر لیتے ہیں کہ اگر ایک دو ساتھی میسر آ جائیں تو کسی کی غیبت میں لپٹ جاتے ہیں۔ روزے کی بھوک میں آدمی کا گوشت بڑا الذیذ معلوم ہوتا ہے اور تجربہ گواہی دیتا ہے کہ اگر روزہ رکھ کے آدمی کو یہ لذیذ مشغلہ مل جائے تو آدمی جھوٹ، غیبت، ہجو اور اس قسم کی دوسری آفتوں کا جن کو حدیث میں 'حصائد اللسان'* سے تعبیر کیا گیا ہے، ایک انبار لگا دیتا ہے اور اسی مشغلہ میں صبح سے شام کر دیتا ہے۔ یہ چیزیں آدمی کے روزے کو بالکل برباد کر کے رکھ دیتی ہیں۔

اس کا ایک علاج تو یہ ہے کہ آدمی خاموشی کو روزے کے ضروری آداب میں سے سمجھے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ پچھلے مذاہب میں چپ رہنا بھی روزے کے شرائط میں داخل تھا۔ چنانچہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام روزہ کی حالت میں صرف اشارہ سے بات کرتی تھیں۔ اسلام نے روزہ داروں پر یہ پابندی تو عائد نہیں کی ہے، لیکن اس پابندی کے نہ ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی روزے میں اپنی زبان کو چھوٹ دے دے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی ضروری اور مفید بات کرنے کا موقع پیش آ جائے تو کر لے، ورنہ خاموش رہے۔ جو شخص ہر قسم کی اناپ شناپ اور جھوٹی سچی باتیں زبان سے نکالتا رہتا ہے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ پھر اس کا محض کھانا پینا چھوڑ دینا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک بالکل بے نتیجہ کام ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

---

* ترمذی، رقم ۲۶۱۶۔

من لم يدع قول الزور و العمل به فليس لله حاجة في أن يدع طعامه و شرابه. (بخاری، رقم ۱۸۰۴)

''جو شخص جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔''

اس کا دوسرا علاج یہ ہے کہ آدمی کا جو وقت گھر کے کام کاج اور معاش کی مصروفیتوں سے فاضل بچے اس کو مفید چیزوں کے مطالعہ میں صرف کرے۔ روزے کے دنوں کے لیے قرآن شریف، حدیث شریف، سیرت نبوی، سیرت صحابہ اور تزکیۂ نفس کی کتابوں کے مطالعہ کا ایک باقاعدہ پروگرام بنا لے۔ خصوصیت کے ساتھ قرآن مجید کے تدبر پر پابندی کے ساتھ کچھ نہ کچھ وقت ضرور صرف کرے۔ قرآن مجید کو روزے کی عبادت کے ساتھ، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، ایک خاص مناسبت ہے۔ اس مناسبت کے سبب سے روزہ دار پر قرآن مجید کی خاص برکتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ہر روزہ دار کو ان برکتوں کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

قرآن مجید اور ماثور دعاؤں کے یاد کرنے کے لیے بھی آدمی کچھ نہ کچھ وقت ضرور نکالے۔ اس طرح قرآن مجید اور مسنون دعاؤں کا آدمی کے پاس آہستہ آہستہ ایک ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے، جو آدمی کے جمع کیے ہوئے مال و اسباب کے ذخیروں سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ریا

ریا کا فتنہ جس طرح تمام عبادتوں کے ساتھ لگا ہوا ہے، اسی طرح روزے کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے۔ بہت سے لوگ روزے تو رکھتے ہیں، بالخصوص رمضان کے روزے، لیکن ہو سکتا ہے کہ ان میں بہت کچھ دخل اس احساس کو بھی ہو کہ روزے نہ رکھے تو پاس پڑوس کے روزہ داروں میں نکو بننا پڑے گا یا لوگوں میں جو دین داری کا بھرم ہے، وہ جاتا رہے گا یا اپنے گھر اور خاندان والے ہی برا مانیں گے۔ اس طرح کے مختلف احساسات ہیں جو رمضان کے روزوں میں شریک بن جاتے ہیں اور اس طرح وہ خلوص نیت آلودہ اور مشتبہ ہو جایا کرتا ہے جو روزے کی حقیقی برکتوں کے ظہور کے لیے ضروری ہے، اس لیے کہ جس بندے میں خدا کی خوش نودی کے سوا کوئی اور محرک شریک ہو جائے، یہ روزہ، وہ روزہ نہیں ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ:

يترك طعامه و شرابه و شهوته من أجلي. الصيام لي و أنا أجزي به. (بخاری، رقم ۱۷۹۵)

''بندہ میرے لیے اپنا کھانا پینا اور اپنی شہوت چھوڑتا ہے۔ روزہ میرے لیے ہے اور میں اس کا بدلہ دوں گا۔''

بلکہ یہ روزہ اسی غرض کے لیے ہو جائے گا، جس غرض کے لیے رکھا گیا ہے۔

اس آفت کا اول علاج تو یہ ہے کہ آدمی اپنی نیت کو ہر دوسرے شائبہ سے حتی الامکان پاک کرنے کی کوشش کرے۔ اسے ہر روز سوچنا چاہیے کہ اپنے روزے کو تمام برکتوں سے محروم کر کے فاقہ کے درجہ میں ڈال دینا انتہائی نادانی ہے، آخر یہ مشقت اٹھانے کا حاصل کیا ہوا، جب کہ یہ دنیا میں بھی موجب کلفت اور آخرت میں بھی موجب وبال بنے؟ اس طرح نفس کے سامنے بار بار روزہ کی قدر و قیمت واضح کرنی چاہیے تا کہ اس کی نگاہ دوسروں کی طرف سے ہٹ کر خدا کی طرف متوجہ ہو۔

اس کا دوسرا علاج یہ ہے کہ آدمی رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ نفلی روزے بھی رکھے اور اس میں دو باتوں کا اہتمام کرے: ایک حتی الامکان اخفا کا، یعنی ان کا اشتہار دینے کی کوشش نہ کرے۔ دوسری اعتدال یا میانہ روی کا، یعنی نفلی روزے اسی حد تک رکھے جس حد تک خواہشات و شہوات کو حالت اعتدال پر لانے کے لیے ان کی ضرورت ہو۔ اگر اس حد سے آدمی بڑھ جائے گا تو وہ چیز خود بھی ایک فتنہ ہے اور اسلام نے اس سے بھی بڑی شدت کے ساتھ روکا ہے۔ روزے کی حیثیت ایک دوا کی ہے۔ دوا اگر ضرورت سے زیادہ استعمال کر لی جائے تو بسا اوقات یہ خود بھی ایک بیماری بن جاتی ہے۔

(تزکیۂ نفس ۲۴۸-۲۵۳)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ساجد حمید

رمضان، عبادات اور للّٰہیت

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

رمضان آتا ہے تو ایک طرح کی تقویٰ کی بہار آ جاتی ہے۔ اکثر لوگ نمازوں اور عبادات کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ روزے کی کیفیات چہروں پر دکھائی دیتی ہیں۔ مسجدوں میں رونق بڑھ جاتی ہے۔ بہت سے لوگوں کا سال کے بعد خدا کی طرف انابت کا عمل بڑے پیمانے پر ظہور پاتا ہے۔ خدا کی وہ منادی جو صدیوں سے انبیا نے بلند کر رکھی ہے کہ توبہ کرو میں تمھارے گناہ بخش دوں گا، فرزندان اسلام رمضان میں اس کے جواب میں رجوع الی اللہ کرتے ہیں۔

لیکن ہم آج ایسے اسلامی مذہب کو مانتے ہیں جو اپنی جامعیت کھو کر محض ایک جزوی دین بن کر رہ گیا ہوا ہے۔ ہم نے صدیوں قبل ہندوستان سے گوتم بدھ اور یونان کے فیثا غورث اور مشرق وسطیٰ سے اخوان الصفا کی باطنیت سے جو مذہبی تصور لیا، اس نے اسلام کے جامع دین کو بھی راہبانہ اور متصوفانہ بنا دیا ہے۔ اس اعتبار سے ہم غزالی کے عہد دینیات میں جیتے ہیں۔ جہاں دین کا منتہاے کمال یہ ہے کہ عبادت و ریاضت کی خاص نہج، یعنی طریقت پر چل کر للّٰہیت حاصل کی جائے، جس کا مطلب خاص طرح کا صفاے قلب اور دوام ذکر الٰہی وغیرہ لیا جاتا ہے۔ اس تصور نے ہمارے دینی اشتغالات کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ ہمارے آئیڈیل وہ لوگ قرار پائے جنھوں نے تصوف کی ریاضتوں سے یہ کمالات حاصل کیے۔ چنانچہ دین کا تصور للّٰہیت سکڑ کر رہ گیا۔ ایک دیانت دار، حق شناس اور محنتی مزدور کم درجہ کا مسلمان قرار پایا اور ایک فقیرِ راہ سڑک پر یا جنگل میں دُھونی رمائے[1] بیٹھا بڑے درجے کا، حالاں کہ وہ مزدور

---

[1] کسی جگہ ٹک کر بیٹھے رہنا۔

جس آزمایش میں ڈالا گیا تھا، وہ اس میں کامیاب تھا، اور یہ جس آزمایش میں ڈالا گیا تھا یہ اس سے مفرور تھا۔

امام غزالی رحمہ اللہ صوفیانہ طرز حیات پر لکھتے ہیں:

''میرا مطمح نظر یہ تھا کہ میں آخرت کی سعادت تقویٰ اور ہواے نفس سے بچ کر حاصل کروں، اور یہ بھی واضح تھا کہ اس عمل کی بلند ترین سطح یہ ہے کہ دل کو اس دنیا سے بے زار کر کے اس کا تعلق دھوکے کی اس دنیا سے کاٹ دیا جائے، اور یہ کہ اخروی دارالخلود کی طرف رغبت رکھی جائے، اور ساری توجہ پوری ہمت لگا کر اللہ کی طرف مبذول کر لی جائے، مگر یہ سب کچھ حاصل نہیں ہوسکتا، جب تک کہ جاہ و مال سے اعراض نہ کر لیا جائے، اور مصروفیات و علائق سے فرار نہ ہوا جائے۔ پھر میں نے اپنی حالت پر نگاہ ڈالی تو کیا دیکھتا ہوں کہ علائق دنیا میں غرق ہوں اور چار جانب سے ان میں گھرا ہوا ہوں۔ پھر میں نے اپنے اعمال کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ سب سے اچھا کام جو میں کرتا ہوں، وہ تدریس کا ہے، اس کی صورت حال بھی یہ ہے کہ میں ایسے علوم سے لگاؤ رکھتا ہوں، جو غیر اہم اور آخرت میں نافع نہیں ہیں۔

...پھر میں (سب چھوڑ چھاڑ کر) شام چلا گیا، وہاں میں تقریباً دو سال تک رہا، تنہائی، خلوت گزینی، ریاضت، اور مجاہدے کے سوا میرے کچھ مشاغل نہ تھے، میری عزلت تزکیۂ نفس، تہذیب اخلاق اور ذکر الٰہی کے لیے تصفیۂ قلب کے مقصد سے تھی، اسی طرح جس طرح میں نے صوفیہ کی کتابوں سے سیکھا تھا۔ میں دمشق کی مسجد میں ایک مدت تک معتکف رہا، میں اس کے مینار پر چڑھ کر اس کا دروازہ بند کر لیتا اور سارا سارا دن اس میں بیٹھا رہتا تھا۔ پھر میں بیت المقدس چلا گیا، ہر روز صخرہ میں داخل ہوتا، اور دروازہ بند کر لیتا تھا۔ پھر میرے اندر حج کا فریضہ ادا کرنے کی تحریک نے سر اٹھایا کہ مکہ و مدینہ کی برکات سے بھی مدد لی جائے۔ یوں خلیل اللہ کی زیارت کے بعد رسول اللہ کی زیارت بھی کی جائے۔ اس مقصد سے میں نے حجاز کی مسافرت اختیار کی۔ پھر مجھ پر جذبات اور میرے بچوں کی دعاؤں نے غلبہ پایا اور میں وطن لوٹ آیا، جب کہ میں اس کی طرف ہرگز لوٹنے والا نہ تھا، اپنے وطن میں بھی میں نے گوشہ نشینی کو ترجیح دیے رکھی، خلوت گزیں رہتا اور ذکر الٰہی کے لیے تصفیۂ قلب جاری رکھا۔ ...ان خلوتوں میں میرے اوپر بہت سے امور منکشف ہوئے جن کا احاطہ ممکن نہیں ہے، بس اتنی بات عرض کیے دیتا ہوں جس سے سب کو نفع ہوگا کہ میں یہ جان گیا ہوں کہ صوفیہ ہی اللہ کے راستے کے سالک ہیں، انھی کی سیرت بہترین سیرت ہے، انھی کا طریقہ صحیح ترین طریقہ ہے، انھی کا اخلاق پاکیزہ ترین اخلاق ہے۔ ...ان کی تمام حرکات و سکنات ظاہر و باطن میں چراغ نبوت کے نور کا شعلہ و شرر ہیں، اس سے بڑھ کر زمیں پر نور نبوت کہیں نہیں کہ جس سے روشنی حاصل کی جائے۔''

(المنقذ من الضلال ۱۷۳-۱۷۷)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس اقتباس سے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ امام غزالی جیسے عبقری نے کس طرح دین کے ایک جزو کو اٹھایا اور پورے دین پر غالب کر دیا ہے[2]۔ اسلامی شرائع میں اعتکاف اور عزلت بہت مختصر عرصہ کی چیز ہے، جس کو انھوں نے برسوں (تقریباً دس برس) اختیار کیے رکھا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ گھر در کی ذمہ داری بچوں پر التفات و نگہ داری، دین کی تدریس و خدمت، سب ایک طرف تھا اور یہ عزلت سب پر حاوی تھی۔ واضح رہے کہ اس کا ثبوت نہ قرآن میں تھا اور نہ سنت میں، بلکہ صرف صوفیانہ کتب میں تھا۔ نبی کریم سے اگر کوئی بات ان کو ملی تو وہ اخبار آحاد میں آئی ہوئی نبوت سے پہلے کی غار حرا کی عزلت گزینی ہے۔ ساری امت جانتی ہے کہ قبل نبوت کا کوئی عمل دین میں حجت نہیں ہے۔ لیکن ان صوفیہ کو یہی ایک واقعہ ملا ہے[3]۔ لکھتے ہیں:

> ”مختصر یوں کہیے کہ جس کو یہ (روحانی) ذوق نصیب نہیں ہوا، وہ لفظی معنی کے سوا نبوت کی حقیقت کو سمجھ ہی نہیں سکتا، اور نہ اولیا کی کرامات کو سمجھ سکتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ کرامات انبیا کی ابتدائی احوال جیسی ہیں۔ نبی کریم کے ابتدائی حالات بھی ایسے ہی تھے، جب آپ غار حرا میں جاتے اپنے رب کے ساتھ خلوت گزیں ہوتے، اور عبادت کرتے تھے۔ عرب آپ کو کہتے کہ محمد اپنے رب کے عاشق ہو گئے ہیں[4]۔“ (المنقذ من الضلال ۱۷۹)

بہرحال، ہمارے عہد تک یہ طبقہ دین کو رہبانیت سے بدل کر اسے للّٰہیت کا نام دیتا ہے۔ بلا شبہ ذکر، عبادت،

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.org

۲؎ ہمارے عہد میں مودودی رحمہ اللہ نے بھی غلبۂ دین کے ایک نبوی فریضہ کو پورے دین پر غالب کر دیا۔

۳؎ واضح رہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اگر یہ واقعہ صحیح بھی ہے تو تب بھی جو معلومات اس کے بارے میں ہم تک پہنچی ہیں، ان کا متصوفانہ ریاضتوں سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا، اور نہ آپ اس طرح کی کسی چیز کے لیے غار میں جاتے تھے، جنھیں امام غزالی نے کرامات اولیا کا نام دیا ہے۔ قرآن کی نصوص واضح طور پر آپ کے ساتھ اس طرح کی منسوب باتوں کی نفی کرتی ہیں۔ مثلاً ’وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ‘ (التکویر ۸۱: ۲۴) یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غیب کے حریص کبھی نہیں رہے، اور ’قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ‘ (یونس ۱۰: ۱۶) وغیرہ۔

۴؎ اس آخری جملے کا کوئی مستند حوالہ نہیں ملتا۔ باقی روایت میں بھی صوفیہ نے تصرف کیا ہے کہ چالیس سال کی عمر میں آپ تنہائی اور عزلت پسند رہنے لگے اور غار حرا میں جا کر تحنث کرنے لگے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہ تھا، بلکہ آپ نے ایک ماہ کے اعتکاف کی نذر مانی تھی۔ بس اسی کو پورا کرنے کے لیے وہاں گئے تھے۔ اگر ان واقعات کو ایسے ہی مان لیا جائے تو تب بھی صوفیانہ ریاضت اس میں موجود نہیں ہے، بلکہ واقعات کی ترتیب یہ ہے کہ آپ کو پہلے رویاے صالحہ آنے لگے، اس کے بعد آپ تنہائی پسند ہوئے، یعنی نبوت کا آغاز پہلے ہوا ہے، نہ کہ آپ کی ریاضتوں کے بعد۔ رویاے صالحہ سے پہلے آپ ایک عام آدمی کی زندگی گزار رہے تھے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ یہ روایت اپنے کئی اجزا میں قرآن سے ٹکراتی ہے۔

وغیرہ میں للّٰہیت ہے، لیکن یہ دین اسلام کا ایک جزو ہے۔

اصل للّٰہیت

اسلام جس للّٰہیت کا تصور دیتا ہے، اس میں دنیا کو تیاگ دینا ہرگز شامل نہیں ہے۔ انسان کی فطرت میں بلاشبہ اللہ کی خاطر جان و مال کا قربان کرنا رکھا گیا ہے۔ ہم انسانوں میں سے بعض کے ہاں یہ جذبہ زیادہ ہوسکتا ہے، جیسے بعض لوگوں میں نوافل ادا کرنے کا، بعض کے ہاں روزے رکھنے کا اور بعض کے ہاں خدمت خلق کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح بعض کے ہاں قربانی وایثار یا ترک دنیا کا داعیہ قوی ہوتا ہے۔ دین کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ان طبعی داعیات کو توازن میں رکھا جائے۔ لہٰذا اسلام نے ہر طبعی ضرورت کے پیش نظر عبادات واعمال مقرر کیے ہیں۔ لیکن کسی ایک کو باقی تمام پر غالب نہیں کیا۔ بالکل اسی طرح، جس طرح اللہ نے بعض کو غصہ ور اور بعض کو نرم خو بنایا ہے۔ دونوں سے تقاضا یہی ہے کہ مثلاً نرم آدمی حق کی غیرت میں اگر سخت ہونا ہو تو ہو، اور غصہ ور کو اعتراف حق کے لیے نرم ہونا پڑے تو نرم ہو۔

ہم انسان جب کوئی دین بناتے ہیں، جیسے تصوف، ہندومت اور بدھ مت وغیرہ تو کسی ایک پہلو کو جو بانی مذہب کا پسندیدہ پہلو ہوتا ہے، اسے غالب کر دیتے ہیں[۵]، جب کہ انبیا کا دین ہدایت الٰہی ہونے کی وجہ سے شخصی پسند ناپسند سے نہیں بنا ہوتا، لہٰذا ان کا دین کسی ایک چیز کو باقی نیکیوں پر غالب نہیں کرتا کہ وہی چیز کل دین بن کر رہ جائے۔ لہٰذا تمام دینی وسماجی داعیات کے لیے ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ ان رجحانات کو اسلامی احکام کے تابع بنائے تا کہ وہ دینی میدان میں متوازن رہے۔

اسلام میں للّٰہیت یہ ہے کہ آدمی تمام دینی و معاشرتی فرائض و واجبات کو للہ ادا کرنے والا ہو۔ جب عبادت کا معاملہ ہو تو عبادت میں؛ معاملات کا موقع ہو، معاملات میں ادائے حقوق للّٰہیت ہے۔ یہ للّٰہیت گوتم بدھ وغیرہ کی تھی کہ دنیا کو تیاگ کر جنگلوں میں دھونی رمائی جائے، جب کہ خدا کو یہ للّٰہیت پسند ہے کہ 'أبغض للّٰہ' اور 'أحب للّٰہ' کے اصول پر میدان کارزار میں جدوجہد کی جائے۔ ہمسایوں اور ذی القربیٰ کے ساتھ نباہ، تلاش رزق، حق گوئی و حق نیوشی، علم وتحقیق کی جستجو، عدل وانصاف کا قیام، قوموں کے مابین جہاں بینی وجہان بانی، غرض حقوق وفرائض کی جو جو ذمہ داریاں عائد ہوں، سب کی بہ توازن بجا آوری ہو۔ بس یہی للّٰہیت ہے کہ یہ سب کام للہ فی اللہ کیے جائیں۔ وہ

۵؎ صرف اتنی باتیں ہی لازم کی ہیں جو کم ازکم ہیں اور ہر مزاج وطبیعت کو راس آتی ہیں۔

آدمی للّٰہیت سے یک سر خالی ہے جس کی ماں بڑھاپے میں بیٹے کی خدمت کی طالب ہو یا جس کی بیوی اس کے التفات وسہارے کی محتاج ہو اور وہ دمشق کی مسجد کے منارے پر ذوق عزلت سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔

ہمارے علاقے میں ایک صاحب تبلیغ پر گئے تو اپنی بیوی کو متوقع ولادت کے دنوں میں گھر میں اکیلے چھوڑ گئے۔ تین ماہ کا دورۂ تبلیغ تھا۔ یوں چھوڑنے کو اللہ کے توکل پر چھوڑنا کہا جاتا ہے۔ ایک دن ہم عصر کے بعد مسجد سے نکلے تو ان صاحب کے گھر کے باہر لوگوں اور پولیس کا رش دیکھا۔ معلوم ہوا کہ گھر بند ہے اور اس میں شدید بو اٹھ رہی ہے۔ پولیس کی موجودگی میں گھر کے تالے توڑ کر لوگ اندر پہنچے تو کیا دیکھا کہ ان صاحب کی بیوی اور اس کے قدموں میں پڑا نوزائیدہ بچہ، دونوں وفات پا چکے ہیں۔ ان کے جسموں کے گلنے سڑنے سے بدبو پورے محلے میں پھیل رہی ہے۔ ان صاحب کا یہ چلہ اسی رہبانیت کی ایک دوسری صورت ہے، جسے للّٰہیت کا نام دیا جاتا ہے۔

دین کا یہ تصور صرف اسی وقت بنا، جب ہم نے للّٰہیت کا تصور متصوفانہ روایتوں سے لیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا صاحب للّٰہیت کون ہو سکتا ہے! کیا انھوں نے کوئی منارہ آباد کیا؟ کیا انھوں نے ایسے تبلیغی اور جہادی مشن بھیجے۔ ان کا حال تو یہ تھا کہ جس کی بوڑھی ماں گھر ہوتی یا بیوی بیمار ہوتی، اس کو جہاد کی اجازت نہ دیتے تھے۔ یہ تو واضح ہے کہ جہاد ایمرجنسی کا معاملہ ہوتا ہے، جس میں جتنی نفری ہو، کم ہوتی تھی، لیکن اس کے باوجود توازن کا یہ عالم تھا کہ آپ ایسے مجاہدین کو جہاد پر نہ لے جاتے تھے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

دین ہماری معروف اصطلاحات میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کا نام ہے۔ ان دونوں کو ہر وقت نبھانے میں لگے رہنا للّٰہیت ہے۔ اس رمضان میں ہمیں اسی حقیقی للّٰہیت کو پیدا کرنے کی طرف بڑھنا چاہیے۔ نہ صرف ہماری عبادات بہتر ہوں، بلکہ ہمارے اخلاق میں درستی آئے۔ ہماری نمازیں صحیح ہو جائیں، والدین، بہن بھائی، ہمسایے، راہ گیر اور سائل کے حقوق ادا ہونے لگیں۔ ہم ملکی قانون کے پابند ہو جائیں۔ ہماری زبان، ہمارے ہاتھ، ہماری نگاہ، ہمارے گمان، ان میں سے کوئی چیز دوسروں کو نقصان نہ پہنچائے تو سمجھ لیجیے کہ للّٰہیت پیدا ہو گئی۔

سچی بات یہ ہے کہ یہی حقیقت میں خدا کو یاد رکھنا ہے، یہی سچا ذکر الٰہی ہے۔ جب بھوک آمادہ کر رہی ہو کہ آدمی کچھ چرا کر کھا لے، اور آدمی خدا خوفی سے ایسا نہ کرے؛ جب غصہ اگلے کو گالی دینے پر اکسا رہا ہو، اور اللہ کے ڈر سے بندہ ایسا نہ کرے، اور جب حسد اور نفرت چغلی کرنے کی صلاح دے رہی ہو، اور خدا کی جواب دہی اسے روک دے، تو سمجھیے کہ یہ بندہ خدا کی یاد سے غافل نہیں، بلکہ یہ للّٰہیت کی معراج پر ہے جسے قرآن نے یوں بیان کیا ہے: 'اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ..' (آل عمران ۳:۱۹۱)، یعنی جو اللہ کو یاد رکھتے ہیں اٹھتے بیٹھتے اور

لیٹے ہوئے۔ گویا زندگی کے امور انجام دیتے ہوئے ہر حال میں خدا کو یاد رکھتے ہیں۔

اس بات کی مزید وضاحت کے لیے ذیل کی حدیث دیکھیں:

إِنَّ أَبَا سَعِيْدٍ الْخُدْرِيَّ حَدَّثَهُ إِنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: "خَمْسٌ مَنْ عَمِلَهُنَّ فِيْ يَوْمٍ كَتَبَهُ اللّٰهُ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ: مَنْ عَادَ مَرِيْضًا، وَشَهِدَ جَنَازَةً، وَصَامَ يومًا، وراح يوم الجمعة، وأعتق رقبة". (صحیح ابن حبان، رقم ۲۷۷۱)

''ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ پانچ چیزیں ہیں جو انھیں ایک دن میں کرنے میں کامیاب ہو گیا وہ اہل جنت میں لکھا گیا: مریض کی عیادت کرے، جنازہ میں شرکت کرے، روزہ رکھے، اور جمعہ کا سفر بھی کرے اور غلام آزاد کرے[۶]۔''

اس حدیث مبارکہ میں دیکھیے کہ ایک ذمہ داریوں سے بھرپور زندگی کا نقشہ ملتا ہے۔ کوئی فوت ہوا ہے تو جنازہ پڑھنا ہے، کوئی بیمار ہوا ہے تو تیمارداری کرنی ہے، استطاعت ہوئی ہے تو غلام کو آزاد کرنا ہے، جمعے کے لیے جامع مسجد تک کا سفر بھی کرنا ہے۔ یہ سب اس حالت میں ہوا ہے کہ رمضان کا روزہ بھی رکھا ہوا ہے[۷]۔ صحیح معنی میں یہی للہیت ہے؛ یہی لوگ اللہ کے راستے کے سالک ہیں؛ انھی کی سیرت بہترین سیرت ہے؛ انھی کا طریقہ صحیح ترین طریقہ ہے؛ انھی کا اخلاق پاکیزہ ترین اخلاق ہے۔

لہٰذا رمضان میں نماز روزے کی بہتری کے ساتھ اپنے اخلاق اور معاملات کی بہتری کرنے کی سعی بھی کرنی چاہیے تاکہ ہم قرآن کی مطلوب للہیت کو حاصل کریں، اور اہل جنت میں شمار کیے جائیں۔ ہم نے جن کو ستایا ہے، ان سے

۶۔ یہ حدیث اس بات پر ابھار رہی ہے کہ ہم مسلسل ایسی ذمہ داریاں ادا کرنے کی کوشش میں لگے رہیں گے تو ایک دن ایسا میسر آ ہی جائے گا جس میں یہ سب کام اکٹھے ہو جائیں۔

۷۔ اسی طرح کا مضمون اس روایت میں بھی ملتا ہے:

أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَقُوْلُ: "مَنْ أَنْفَقَ زَوْجَيْنِ مِنْ شَيْءٍ مِنَ الْأَشْيَاءِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، دُعِيَ مِنْ أَبْوَابِ، - يَعْنِي الْجَنَّةَ، - يَا عَبْدَ اللّٰهِ، هٰذَا خَيْرٌ، فَمَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الصَّلَاةِ دُعِيَ مِنْ بَابِ الصَّلَاةِ، وَمَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الْجِهَادِ دُعِيَ مِنْ بَابِ الْجِهَادِ، وَمَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الصَّدَقَةِ دُعِيَ مِنْ بَابِ الصَّدَقَةِ، وَمَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الصِّيَامِ دُعِيَ مِنْ بَابِ الصِّيَامِ، وَبَابِ الرَّيَّانِ"، فَقَالَ أَبُوْ بَكْرٍ: مَا عَلٰى هٰذَا الَّذِي يُدْعَى مِنْ تِلْكَ الْأَبْوَابِ مِنْ ضَرُوْرَةٍ، وَقَالَ: هَلْ يُدْعَى مِنْهَا كُلِّهَا أَحَدٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: "نَعَمْ، وَأَرْجُوْا أَنْ تَكُوْنَ مِنْهُمْ يَا أَبَا بَكْرٍ". (صحیح بخاری ۳۶۶۶)

رمضان میں معافی مانگ لیں۔ عہد کریں کہ چغلی غیبت نہیں کریں گے، دھوکا اور فریب چھوڑ دیں گے۔ لوگوں کے حقوق پورے کریں گے۔ خدا کا حق ادا کریں گے۔ گویا دین کا کوئی جز و نہیں، بلکہ پورا دین اپنائیں گے۔ ذیل کی حدیث میں محض عبادت وریاضت کو للّٰہیت سمجھنے کی واضح طور پر تردید سامنے آتی ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: يَارَسُولَ اللّٰهِ، إِنَّ فُلَانَةَ يُذْكَرُ مِنْ كَثْرَةِ صَلَاتِهَا، وَصِيَامِهَا، وَصَدَقَتِهَا، غَيْرَ أَنَّهَا تُؤْذِي جِيرَانَهَا بِلِسَانِهَا، قَالَ: "هِيَ فِي النَّارِ"، قَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، فَإِنَّ فُلَانَةَ يُذْكَرُ مِنْ قِلَّةِ صِيَامِهَا، وَصَدَقَتِهَا، وَصَلَاتِهَا، وَإِنَّهَا تَصَدَّقُ بِالْأَثْوَارِ مِنَ الْأَقِطِ، وَلَا تُؤْذِي جِيرَانَهَا بِلِسَانِهَا، قَالَ: "هِيَ فِي الْجَنَّةِ".

(مسند احمد، رقم ۹۶۷۵)

''ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے پوچھا: اے رسول اللہ، فلاں خاتون ہے، اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ بہت نمازیں پڑھتی ہے، روزے بھی بہت رکھتی ہے، اور صدقات بھی بہت دیتی ہے، مگر یہ کہ بدزبانی سے ہمسایوں کو اذیت دیتی ہے۔ آپ نے فرمایا: دوزخ میں جائے گی۔ اس شخص نے پھر پوچھا کہ اے رسول اللہ، فلاں خاتون کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نفل روزے بہت کم رکھتی ہے، صدقہ و خیرات بھی کم کرتی ہے: وہ صدقہ میں سوکھی پنیر کے ٹکڑے دے دیتی ہے، نفل بھی کم ہی پڑھتی ہے، لیکن اپنی زبان سے ہمسایوں کو نہیں ستاتی۔ آپ نے فرمایا: جنت میں جائے گی۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس دوزخی بڑھیا اور اس تارک دنیا میں کوئی فرق نہیں ہے، اس کی بدزبانی سے لوگ اذیت میں ہوتے ہیں اور اس کی ذمہ داریوں کے فرار سے اس کے تعلق دار اذیت میں ہوتے ہیں۔

محمد وسیم اختر مفتی

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا

(۶)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

عہد صدیقی

رمضان ۶ ھ میں سریۂ زید بن حارثہ ہوا جس میں ام قرفہ کے نام سے مشہور فاطمہ بنت بدر اور اس کی بیٹی ام زمل سلمٰی بنت مالک مسلمانوں کی قید میں آئیں۔ ام قرفہ کو بری طرح قتل کر دیا گیا، کیونکہ یہ اسلامی حکومت کے خلاف سازشیں کرتی تھی۔ ام زمل حضرت عائشہ کے حصے میں آئی اور اسلام قبول کیا، انھوں نے اسے آزاد کر دیا۔ اپنی قوم میں واپس جا کر یہ مرتد ہو گئی اور ایک لشکر اکٹھا کر لیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ارتداد کا طوفان اٹھا تو ام زمل نے غطفان، طے، سلیم اور ہوازن قبائل کے شکست خوردوں کو جمع کیا اور خلافت اسلامی کے خلاف بغاوت کی ٹھانی۔ اسے حضرت خالد بن ولید نے شکست سے دوچار کیا۔

حضرت ابوبکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عالیہ (بالائی مدینہ) میں ملنے والا بنونضیر کا باغ حضرت عائشہ کو ہبہ کر چکے تھے۔ مرض الموت میں سیدہ عائشہ ان کی خبر لینے آئیں تو انھوں نے یہ باغ لوٹانے کی درخواست کی تاکہ یہ سارے وارثوں کے حصے میں آ جائے۔ ان کے ذہن میں حضرت حبیبہ بنت خارجہ سے پیدا ہونے والی ام کلثوم تھی جس نے ابھی جنم نہ لیا تھا، انھوں نے اس کے لڑکی ہونے کی پیشین گوئی بھی کر دی۔

اپنے آخری وقت میں حضرت ابوبکر نے وصیت کی کہ جو کپڑے انھوں نے بیماری میں پہن رکھے تھے، انھیں دھولیا جائے اور دو کپڑے بڑھا کر ان کا کفن تیار کر لیا جائے۔ کپڑوں پر زعفران کے دھبے لگے تھے۔ حضرت عائشہ نے کہا: ابا جان، اللہ نے آپ کو کشادگی دی ہے، اس لیے کفن خرید لیں۔ انھوں نے جواب دیا: نئے کپڑے کی تو مردے سے زیادہ زندہ کو ضرورت ہوتی ہے۔ قیامت کی گھڑی ایسی ہو گی کہ کپڑے گل کر پگھلے تانبے یا تیل کی تلچھٹ جیسے ہو جائیں گے (یا پیپ میں لتھڑ جائیں گے)، اس لیے نیا کپڑا لگانے کا کیا فائدہ؟ (بخاری، رقم ۱۳۸۷)۔ اپنے والد کی وفات پر حضرت عائشہ نے گریہ کیا تو حضرت عمر نے انھیں منع کیا۔ عورتوں نے بین کرنا نہ چھوڑا تو انھوں نے ہشام بن ولید سے کہا: ابوبکر کی بہن کو باہر لاؤ۔ ہشام حضرت ام فروہ بنت ابوقحافہ کو باہر لائے تو حضرت عمر نے ان کو درہ دے مارا، تب بین رکا۔

عہد فاروقی

خلیفۂ دوم حضرت عمر نے ازواج مطہرات کا وظیفہ دس ہزار مقرر کیا، تاہم حضرت عائشہ کے دو ہزار بڑھا کر بارہ ہزار لکھوائے اور کہا: وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت محبوب تھیں۔ حضرت عائشہ نے اضافی دو ہزار قبول نہ کیے۔

حضرت عمر نے حضرت عائشہ کی سوتیلی بہن حضرت ام کلثوم کو نکاح کا پیغام بھیجا تو انھوں نے انکار کر دیا اور کہا: مجھے عمر سے عقد کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کٹھن زندگی بسر کرتے ہیں اور عورتوں پر سختی کرتے ہیں۔ حضرت ام کلثوم حضرت عائشہ کی ترغیب پر بھی آمادہ نہ ہوئیں تو انھوں نے حضرت عمرو بن عاص کو معاملہ سلجھانے کی ذمہ داری سونپی۔ حضرت عمرو نے حضرت عمر کو سمجھایا کہ ام کلثوم نوعمر ہیں، آپ کے مزاج کو برداشت نہ کر پائیں گی۔ میں آپ کو اس سے بہتر رشتہ تجویز کرتا ہوں، ام کلثوم بنت علی سے نکاح کر لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا غلے اور بیش قیمت سامان سے لدا ہوا ۷۰۰ اونٹوں پر مشتمل قافلہ آیا تو مدینہ میں غل مچ گیا۔ سیدہ عائشہ اپنے گھر میں تھیں، پوچھا: یہ غوغا کیسا ہے؟ انھیں بتایا گیا کہ حضرت عبدالرحمٰن کا قافلہ ہر قسم کا ساز و سامان لے کر شام سے مدینہ میں وارد ہوا ہے۔ فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''میں نے دیکھا کہ عبدالرحمٰن جنت میں گھسٹ کر جا رہا ہے۔'' حضرت عبدالرحمٰن کو حضرت عائشہ کی بات معلوم ہوئی تو کہا: میں کوشش کروں گا کہ چل کر جاؤں۔ یہ کہہ کر اونٹ، ان پر لدا ہوا غلہ، کجاوے اور پالان سب اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیے (مسند احمد، رقم ۲۴۸۴۲)۔

قاتلانہ حملے کے بعد حضرت عمر نے اپنے بیٹے حضرت عبداللہ کو ام المومنین سیدہ عائشہ کے پاس بھیجا اور فرمایا: ان سے کہنا، عمر سلام کہتا ہے، امیر المومنین نہ بولنا۔ پھر اجازت مانگنا کہ انھیں ان کے دونوں صاحبوں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر کے ساتھ دفن کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ حضرت عائشہ اپنے حجرے میں بیٹھی رو رہی تھیں، حضرت عمر کی درخواست سن کر فرمایا: وہ جگہ میں نے اپنے لیے رکھی تھی، لیکن اب اپنے اوپر عمر کو ترجیح دوں گی۔ حضرت عمر نے حضرت عبداللہ کو وصیت کی کہ میری میت جب حجرۂ عائشہ پہنچے تو دوبارہ اذن مانگنا۔ اگر انھوں نے اس وقت منع کر دیا تو عام مسلمانوں کے قبرستان میں دفنا دینا (بخاری، رقم ۳۷۰۰)۔ اپنا جانشین منتخب کرنے کے لیے حضرت عمر نے جو مجلس شوریٰ بنائی، اسے تلقین کی کہ حضرت عائشہ سے اجازت لے کر ان کے حجرہ کے پاس بیٹھ کر مشورہ کرنا، لیکن حجرے میں داخل نہ ہونا۔

شہید مظلوم اور حضرت عائشہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ایک بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ عائشہ کی چادر اوڑھے اپنے بستر پر آرام فرما رہے تھے۔ آپ کی ٹانگ (یا ران) کا کچھ حصہ ڈھکنے سے رہ گیا تھا۔ اس اثنا میں حضرت ابوبکر آئے، آپ نے ان کو اندر بلا لیا اور خود لیٹے رہے۔ وہ اپنی بات کر کے چلے گئے تو حضرت عمر آئے۔ آپ نے انھیں بھی اذن ملاقات دے دیا اور خود اسی طرح استراحت فرماتے رہے۔ اتفاق سے کچھ دیر بعد حضرت عثمان بھی تشریف لے آئے۔ آپ بیٹھ گئے اور کپڑے درست کر کے بدن اچھی طرح ڈھانپا۔ حضرت عثمان اندر داخل ہوئے، ضروری بات چیت کی اور رخصت ہوئے۔ حدیث کے راوی محمد بن ابوحرملہ کہتے ہیں: میں نہیں کہتا کہ یہ ایک ہی دن کا واقعہ ہے۔ حضرت عثمان کے جانے کے بعد حضرت عائشہ نے پوچھا: یارسول اللہ، کیا وجہ ہے کہ ابوبکر آئے تو آپ نے کوئی اہتمام نہ کیا، پھر عمر آئے تو آپ نے کوئی پروا نہ کی۔ جب عثمان آئے تو آپ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور کپڑے درست کیے؟ فرمایا: عثمان شرمیلے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہوا، اگر اسی حالت میں انھیں آنے دیا تو وہ اپنی بات بھی نہ کر پائیں گے۔ کیا میں اس شخص سے حیا نہ کروں جس سے فرشتے بھی شرماتے ہیں؟ (مسلم، رقم ۶۲۸۷)۔

حضرت عثمان نے منیٰ میں نماز قصر کیے بغیر چار رکعت پڑھی تو صحابہ نے اعتراض کیا۔ انھوں نے دلیل دی کہ میں نے مکہ پہنچ کر شادی کی ہے، اس لیے یہ شہر میرے گھر کے مانند ہو گیا۔ حضرت عائشہ کی تاویل تھی کہ عثمان جس شہر میں بھی ہوں، امیر المومنین ہیں۔ ان کی تاویل قبول نہ کی گئی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ مقام رسالت پر فائز

ہونے کے باوجود سفر میں قصر کیا کرتے تھے۔

۳۵ھ میں بلوائیوں نے حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کیا جو اواخر ذی قعد سے ۱۸ر ذی الحجہ تک جاری رہا۔ حج کے ایام قریب تھے۔ حضرت عائشہ سفر حج کے لیے تیار ہوئیں تو مروان بن حکم نے کہا: آپ کا نہ جانا بہتر ہے، شاید بلوائی آپ سے ڈرتے ہوئے انتہائی کارروائی نہ کریں۔ انھوں نے جواب دیا: مجھے اندیشہ ہے، اگر میں نے انھیں کوئی مشورہ دیا تو یہ میرے ساتھ ام حبیبہ والا برتاؤ نہ کریں۔ حضرت عائشہ نے اپنے بھائی محمد کو بھی ساتھ چلنے کو کہا، لیکن وہ نہ مانے۔ بلوائی حنظلہ بن ربیع (حنظلہ کاتب) نے ان کو جانے سے روکا۔

حج کرنے کے بعد حضرت عائشہ مدینہ لوٹ رہی تھیں کہ حضرت عثمان کی شہادت کی خبر ملی۔ وہ راستے ہی سے مکہ واپس ہو گئیں اور کہا: حضرت عثمان کو مظلومی کی حالت میں شہید کیا گیا، اللہ ان کے قاتلوں پر لعنت کرے۔ میں ضرور ان کے قصاص کا مطالبہ کروں گی۔ اس اثنا میں حضرت طلحہ اور حضرت زبیر مدینہ سے مکہ پہنچے، ان سے مشورے کے بعد حضرت عائشہ نے بصرہ کو اپنا مرکز بنانے کا پروگرام بنایا۔ عہد عثمانی کے گورنر یعلیٰ بن امیہ (بن منیہ: ماں کا نام) نے چھ سو اونٹ اور چھ لاکھ درہم دیے۔ دوسرے گورنر ابن عامر نے بھی زر کثیر فراہم کیا۔ مکہ میں منادی کرا دی گئی کہ ام المومنین، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر بصرہ جا رہے ہیں۔ جو اسلام کی سربلندی چاہتا ہے، حضرت عثمان کا خون بہا لینا اور ان کے قتل کو جائز سمجھنے والوں سے جنگ کرنا چاہتا ہے، شامل ہو جائے، اگرچہ اس کے پاس سواری اور سامان سفر نہ ہو۔ اس طرح ایک ہزار (دوسری روایت: تین ہزار) کے لگ بھگ سپاہی فراہم ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی والدہ حضرت ام فضل نے حضرت علی کو خبر کر دی۔ حضرت عثمان کی شہادت کے چار ماہ بعد لشکر روانہ ہوا تو باقی امہات المومنین اس صورت حال پر روتی روتی ذات عرق تک ساتھ گئیں، پھر مدینہ جانے کے لیے لوٹ گئیں۔ اس نسبت سے اس دن کو 'روز گریہ' کہا گیا۔ مکہ سے نکلنے کے بعد مروان بن حکم نے اذان دی اور پوچھا: لشکر کی امارت کسے دوں اور نماز کا امام کس کو مقرر کروں؟ حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت محمد بن طلحہ نے اپنے اپنے والد کا نام لیا۔ حضرت عائشہ کو معلوم ہوا تو سخت ناراض ہوئیں اور کہا: تم ہماری جمعیت میں تفرقہ ڈالنا چاہتے ہو؟ انھوں نے حضرت عتاب بن اسید کو نماز پڑھانے کا حکم دیا۔

حضرت عائشہ عسکر نامی اونٹ پر سوار تھیں جو یعلیٰ بن امیہ نے بنو عرینہ کے ایک شخص سے ایک اونٹنی اور چار سو درہم (یا اسّی دینار) کے عوض خریدا۔ لشکر بصرہ پہنچنے سے پہلے حوأب نامی چشمے پر پہنچا تو کتے بھونکنا شروع ہو گئے۔ سیدہ عائشہ کو معلوم ہوا تو بلند آواز میں چلانے لگیں: 'إنا للّٰه و إنا إليه راجعون'، تو وہ میں تھی۔ ایک دن رسول اللہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ازواج جمع تھیں کہ آپ نے فرمایا: کاش، مجھے علم ہو جائے، تم میں سے کون سی ہے جس پر حوأب کے کتے بھونکیں گے (مسند احمد، رقم ۲۴۲۵۴۔ مستدرک حاکم، رقم ۴۶۱۳)۔ حضرت عائشہ نے اونٹ کی ٹانگ پر چابک مارا اور اسے بٹھا کر کہا: مجھے واپس لے چلو، میں ہی حوأب چشمے والی ہوں۔ لشکر ایک دن اور رات رکا رہا، حضرت عبداللہ بن زبیر مناتے رہے اور وہ انکار کرتی رہیں۔ آخرکار انھوں نے 'بچو! بچو! علی پہنچنے والے ہیں' کا نعرہ لگایا تو وہ بصرہ کی طرف چلیں۔ حفیر کے مقام پر انھوں نے پڑاؤ ڈالا اور احنف بن قیس، صبرہ بن شیمان اور دیگر اہل بصرہ کو خط لکھ کر اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ بصرہ میں حضرت علی کے مقررہ گورنر حضرت عثمان بن حنیف نے عمران بن حصین اور ابوالاسود دؤلی کو بات چیت کے لیے بھیجا۔ ان دونوں نے حفیر میں حضرت عائشہ، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر سے الگ الگ ملاقاتیں کیں۔ حضرت عثمان کے قصاص کا مطالبہ سامنے آنے پر حضرت عثمان بن حنیف نے اہل بصرہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ہمارا شمار قاتلین عثمان میں نہیں ہوتا، اس لیے اس لشکر کو واپس جانے پر مجبور کر دو۔ تب حضرت عائشہ کا لشکر آگے بڑھا اور بصرہ کے محلّہ مربد پہنچا۔ حضرت عائشہ نے خطاب کرتے ہوئے کہا: باغیوں نے حضرت عثمان کے خلاف محاذ آرائی کرتے ہوئے شہر مدینہ اور ماہ حرام کی حرمت کو پامال کیا۔ تم پر لازم ہے کہ ان کے قاتلوں کو پکڑو اور اللہ کی حدود قائم کرو۔ یہ تقریر سن کر حضرت عثمان بن حنیف کے کچھ ساتھی الگ ہو کر حضرت عائشہ کی فوج میں شامل ہو گئے۔ جاریہ بن قدامہ نے کہا: ام المومنین، سیدنا عثمان کے شہید ہونے سے زیادہ سنگین بات یہ ہے کہ آپ اس لعنتی اونٹ پر سوار ہو کر گھر سے باہر نکل آئی ہیں۔ ایک نوجوان نے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کو طعنہ دیا: میں تم دونوں کی ماں کو تو دیکھ رہا ہوں، کیا اپنی بیویوں کو بھی نکال لائے ہو؟ میں تمھارا ساتھ نہ دوں گا۔

۲۵ ربیع الثانی ۳۶ھ کو مربد میں جیش عائشہ کا گورنر عثمان کی فوج سے ٹکراؤ ہوا۔ سیدہ عائشہ نے حکم جاری کیا، صرف ایسے شخص سے جنگ کی جائے جو ابتدا کرے اور جس کا حضرت عثمان کی شہادت سے تعلق ہو۔ پہلے دن ہلکی جھڑپ ہوئی، حکیم بن جبلہ نے ابتدا کی، گھڑسواروں کے ساتھ آگے بڑھا تو حضرت عائشہ کے سپاہیوں نے تیراندازی کی۔ شام تک حضرت عائشہ کی فوج مقبرہ بنو مازن تک آ گئی۔ دوسرے روز دارالرزق کے میدان میں گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں حضرت عثمان بن حنیف کی فوج کو بہت جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ فریقین جنگ سے عاجز آئے تو صلح پر آمادہ ہو گئے۔ یہ طے ہوا کہ ایک شخص کو مدینہ منورہ بھیج کر اس بات کی تصدیق کرائی جائے گی کہ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر سے زبردستی حضرت علی کی بیعت کرائی گئی تھی۔ اگر یہ ثابت ہو گیا تو حضرت عثمان بن حنیف بصرہ چھوڑ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دیں گے اور اگر حقیقت اس کے برعکس ہوئی تو حضرت طلحہ اور حضرت زبیر واپس ہو جائیں گے۔ قاضیِ بصرہ کعب بن سور اس بات کی تصدیق کر کے لوٹے، لیکن گورنر عثمان نے معاہدے کے مطابق بصرہ نہ چھوڑا۔ جنگ پھر چھڑ گئی۔ عشا کا وقت تھا، مسجد کے اندر قتال کرنے کے بعد حضرت عثمان بن حنیف کو پکڑ لیا گیا۔ چالیس کوڑے مارنے کے بعد ڈاڑھی اور بھووں کے بال اکھاڑے گئے اور پھر حضرت عائشہ کے کہنے پر چھوڑ دیا گیا۔ اس معرکے میں حضرت عثمان کا قاتل حکیم بن جبلہ اور اس کے ستر ساتھی اور مددگار مارے گئے۔ جنگ سے فراغت کے بعد سیدہ عائشہ نے اہالیان کوفہ، یمامہ و مدینہ کو خط بھیجے کہ حضرت علی کا ساتھ چھوڑ دیں اور قاتلین عثمان کو سزا دلوانے میں میری مدد کریں۔ زید بن صوحان نے جواب دیا: اللہ ام المومنین پر رحم کرے، اللہ نے ان پر گھر میں رہنا لازم کیا ہے اور ہمیں قتال کا حکم دیا ہے۔ ہم برابر ان کی نصرت کرتے رہیں گے، اگر وہ گھر سے چپک کر رہیں۔ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کا بصرہ پر قبضہ ہو گیا تو ان کے مخالفین چھپ گئے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت علی نے حضرت قعقاع کو بصرہ بھیجا تاکہ وہ حضرت طلحہ و حضرت زبیر سے ملیں اور جماعت و الفت کی اہمیت ان پر واضح کریں۔ حضرت قعقاع پہلے حضرت عائشہ سے ملے اور پوچھا: اماں جان! آپ اس شہر میں کیونکر آئی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: لوگوں میں صلح وصفائی کرانے کے لیے۔ تو پھر طلحہ و زبیر کو پیغام بھیجیں کہ میری بات سن لیں۔ حضرت قعقاع ان دونوں سے ملے تو پوچھا: کیا آپ کا مقصد بھی وہی ہے جو ام المومنین کا ہے؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا تو پوچھا: یہ اصلاح کس طرح ہو گی؟ انھوں نے جواب دیا: قاتلین عثمان کو چھوڑ دینا ترک قرآن ہو گا۔ حضرت قعقاع نے کہا: تم نے بصرہ سے تعلق رکھنے والے قاتلوں کو تو مار دیا، لیکن ان سے پہلے چھ سو افراد کا قتل کر چکے تھے۔ اب تم حرقوص بن زہیر کے درپے ہو اور چھ ہزار کی فوج اس کا دفاع کرنے کے لیے تیار ہے۔ یہ قتل و غارت کہاں رکے گی؟ حضرت عائشہ نے پوچھا: تمھارا کیا مشورہ ہے؟ حضرت قعقاع نے کہا: اس کا علاج جنگ بندی کر کے حالات کو پرسکون کرنا ہے۔ آپ قصاص موخر کر کے حضرت علی کی بیعت کر لیں تو خیر و رحمت کا ظہور ہو گا۔ حضرت طلحہ و حضرت زبیر نے اس بات سے اتفاق کر لیا۔ حضرت عائشہ نے بھی حضرت علی کو پیغام بھیجا کہ وہ اصلاح کے لیے آئی ہیں۔ حضرت قعقاع نے حضرت علی کو خبر دی تو وہ بہت خوش ہوئے۔

جنگ جمل

جمادی الاولیٰ ۳۶ھ (۷/ نومبر ۶۵۶ء، دوسری روایت: ۱۵ جمادی الثانی ۳۶ھ) میں بصرہ کے قصر عبید اللہ بن زیاد

کے پاس جنگ جمل ہوئی۔ حضرت علی، حضرت عمار بن یاسر، حضرت طلحہ، حضرت زبیر بن عوام، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت سہل بن حنیف اور دیگر کئی صحابہ نے اس میں حصہ لیا۔ حضرت علی نے حضرت طلحہ و حضرت زبیر کو پیغام بھیجا کہ قعقاع کے ساتھ کی جانے والی بات پر قائم رہتے ہوئے جنگ سے باز رہو۔ انھوں نے اس سے اتفاق کیا۔ بصرہ کی فوج میں شامل قبائل کو پورا یقین تھا کہ صلح ہو جائے گی۔ فریقین نے خوشی اور اطمینان سے رات بسر کی، دوسری طرف خلیفۂ مظلوم کے قاتلوں میں بے حد اضطراب رہا۔ پو پھٹنے سے پہلے ان کے دو ہزار کے قریب آدمیوں نے تلواریں سونتیں اور حضرت طلحہ و حضرت زبیر کی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ دونوں صحابیوں نے اسے اہل کوفہ کا حملہ سمجھا۔ ادھر حضرت علی نے شور و غوغا سنا تو پوچھا: کیا ہوا؟ انھیں بتایا گیا کہ رات گئے حملہ ہوا تھا جس کا ہم نے بھرپور جواب دے دیا ہے۔ حضرت علی نے اسے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کی شرارت قرار دیا۔ ابن سبا کے ساتھی خوب قتل و غارت کر رہے تھے، حضرت علی پکار رہے تھے: رکو! رکو! لیکن کوئی ان کی سن نہ رہا تھا۔ بصرہ کے قاضی کعب بن سور حضرت عائشہ کے پاس آئے اور جنگ رکوانے کی استدعا کی۔ وہ بنو ازد کی مسجد حدان میں ٹھیری ہوئی تھیں، کجاوے پر سوار ہو کر نکلیں، لیکن تب تک جنگ کا بازار گرم ہو گیا تھا۔

جنگ جمل کی صبح حضرت علی خچر پر سوار ہو کر آئے اور حضرت زبیر کو بلا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد یاد دلایا: زبیر، تم علی سے قتال کرو گے، حالاں کہ تم ظالم ہو گے۔ حضرت زبیر نے کہا: ہاں! میں یہ بات بھول چکا تھا۔ آپ نے یاد کرا دیا ہے تو آپ کے خلاف ہرگز قتال نہ کروں گا۔ پھر انھوں نے اپنے گھوڑے (ذوالخمار) کا رخ موڑا اور فوج کی صفیں چیرتے ہوئے میدان جنگ چھوڑ گئے (مستدرک حاکم، رقم ۵۵۷۳)۔ حضرت زبیر نے جاتے جاتے حضرت عائشہ کو بھی اپنے رجوع سے مطلع کر دیا۔ انھوں نے اپنے بیٹے حضرت عبداللہ کے کہنے پر بطور کفارہ اپنے غلام سرجس (یا مکحول) کو آزاد بھی کیا۔ ابن جرموز نے حضرت زبیر کا پیچھا کیا اور انھیں شہید کر کے ان کی تلوار حضرت علی کو پیش کی۔ حضرت علی نے اسے دوزخ کی وعید سنائی اور جنگ کے اختتام پر تلوار حضرت عائشہ کو بھیج دی۔

دوپہر کے بعد جنگ سیدہ عائشہ کی کمان میں لڑی گئی اور عصر تک جاری رہی۔ حضرت عائشہ نے کعب بن سور کو مصحف قرآنی دے کر کہا: لوگوں کو اس کی طرف بلاؤ۔ وہ کھڑے ہی ہوئے تھے کہ کوفی فوج کے مقدمہ میں موجود عبداللہ بن سبا اور اس کے ساتھیوں نے تیروں کی بوچھاڑ کر کے انھیں شہید کر دیا۔ کچھ تیر حضرت عائشہ کے کجاوے کو بھی لگے۔ وہ اللہ اللہ پکار کر حضرت عثمان کے قاتلوں کو بددعائیں دینے لگیں۔ پھر کہا: لوگو، عثمان کے قاتلوں پر لعنت بھیجو۔ حضرت علی نے پوچھا: یہ شور و غل کیسا ہے؟ لوگوں نے بتایا: عائشہ قاتلین عثمان پر لعنت بھیج رہی ہیں۔ حضرت علی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بھی لعنت بھیجنے میں ان کے ہم آواز ہو گئے۔ اسی اثنا میں حضرت عائشہ نے مضری دستے کو زوردار حملہ کرنے کا حکم دیا۔ جنگ شدت پکڑ گئی، حضرت علی نے اپنے بیٹے محمد بن حنفیہ کو پرچم لے کر آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ وہ پیش قدمی نہ کر سکے تو پرچم خود تھام لیا۔ حضرت علی کے جرنیل زید بن صوحان شہید ہوئے اور حضرت عائشہ کی فوج غالب ہونے لگی تو انھوں نے ربیعہ اور یمن کے دستوں کو بلایا۔ ان کے آنے پر جنگ میں پھر تیزی آئی، دونوں اطراف کے فوجی گتھم گتھا ہو گئے، فوجوں کے میمنہ و میسرہ قلب سے جا ملے۔ حضرت عائشہ کے کمانڈر عبدالرحمٰن بن عتاب قتل ہوئے تو وہ میسرہ میں کھڑے بنوازد کے رسالے کو مخاطب کر کے پکاریں: آج وہ دلیری دکھاؤ جس کی ہم مثالیں سنا کرتے تھے، مقدمہ میں موجود بنوناجیہ کو آواز دی: اپنی قریشی ابطحی تلواروں کی کاٹ دکھا دو، پھر بنوضبہ اور بنوعدی کو دلیری دلائی۔

حضرت عائشہ کے اونٹ عسکر کی حفاظت کے لیے الگ دستہ مامور تھا۔ اونٹ کی مہار تھامنے والوں میں سے ستر افراد کے ہاتھ کٹ گئے، ان میں سے چالیس کی جانیں گئیں۔ محمد بن طلحہ سجاد آخری دم تک عسکر کے سامنے ثابت قدم رہے، ایک جتھے نے مل کر ان کی جان لی۔ عمرو بن اشرف نے لگام پکڑی تو جو سامنے آتا، تلوار کا وار کر کے اسے گرا دیتے۔ حارث بن زہیر نے ان کا مقابلہ کیا، دونوں مارے گئے۔ کئی دلیروں نے جان کا نذرانہ دیا، پھر حضرت عبداللہ بن زبیر نے آگے بڑھ کر باگ تھامی۔ مالک بن حارث اشتر نے ان پر حملہ کیا، سر کی شدید چوٹ کے علاوہ انھیں ستر سے زائد زخم آئے۔ اب بنوعدی نے عسکر کے دفاع کی ذمہ داری سنبھالی۔ بصرہ کے سابق قاضی عمرہ بن یثربی یا ان کے بھائی عمرو بن یثربی اونٹ کے سر پر کھڑے تھے کہ حضرت علی بولے: اونٹ پر حملہ کون کرے گا؟ ہند بن عمرو جملی نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ عمرہ نے انھیں روکا اور دو واروں میں قتل کر دیا۔ پھر علبا بن ہیثم بڑھے اور عمرہ کے ہاتھوں ختم ہوئے۔ عمرہ نے سیحان بن صوحان کو بھی موت سے ہم کنار کیا، پھر صعصعہ بن صوحان کو شدید زخمی کیا اور وہ بھی چل بسے۔ حضرت عمار پکارے: تو نے ایک مضبوط قلعے (سیدہ عائشہ) کی پناہ لے رکھی ہے، تمھارے تک پہنچنے کی راہ نہیں۔ تو اپنے دعوے میں اگر سچا ہے تو اس لشکر سے نکل کر باہر آ اور میرے ساتھ مبارزت کر۔ عمرہ نے اونٹ کی مہار بنوعدی کے ایک شخص کو پکڑائی اور فوجوں کے مابین کھڑے ہو گئے۔ حضرت عمار سامنے آئے تو عمرہ نے وار کیا جو حضرت عمار نے چمڑے کی ڈھال سے بچایا، پھر انھوں نے تاک کر عمرہ کے پاؤں کا نشانہ لیا۔ پاؤں کٹ جانے سے وہ پیٹھ کے بل آن گرے۔ انھیں قید کر کے حضرت علی کے پاس لے جایا گیا تو انھوں نے رحم کی اپیل کی، لیکن حضرت علی نے یہ کہہ کر قتل کرا دیا کہ کیا تین آدمیوں کی جان لینے کے بعد بھی معافی کی گنجایش ہے؟ حضرت علی نے اپنے سپاہیوں کو پھر حکم دیا کہ سیدہ عائشہ کے اونٹ 'عسکر' کو نشانہ بناؤ، کیونکہ اس کے گرے بغیر جنگ ختم نہ ہو گی۔ ربیعہ عقیلی نے

حفاظت پر مامور ایک عدوی کو للکارا، لڑتے لڑتے دونوں شدید زخمی اور جاں بحق ہوئے۔ حارث ضبی نے نکیل تھامی اور یہ مشہور رجز پڑھی:

نحن بنو ضبة أصحاب الجمل　　نبارز القرن إذا القرن نزل

''ہم قبیلۂ بنو ضبہ کے لوگ جمل والے ہیں، ہم سر کو دو بدو مقابلے کے لیے للکارتے ہیں، جب وہ سواری سے اتر آتا ہے۔''

ننعى ابن عفان بأطراف الاسل　　الموت أحلى عندنا من العسل

''ہم نیزوں کے کناروں کے ذریعے عثمان بن عفان کی شہادت کی خبر دیتے ہیں، موت ہمارے لیے شہد سے زیادہ میٹھی ہے۔''

ردوعلينا شيخنا ثم بجل

''ہمارا شیخ (عثمان) ہمیں لوٹا دو پھر یہی کافی ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: میرا اونٹ پرسکون رہا، حتیٰ کہ بنوضبہ کی آوازیں آنی بند ہو گئیں۔ آخرکار، ایک شخص نے اونٹ کے پاؤں پر تلوار ماری تو وہ بلبلا کر سینے کے بل بیٹھ گیا اور اس کی نکیل ٹوٹ گئی۔ حضرت محمد بن طلحہ نے باگ تھامی تو کہا: اماں جان، مجھے اپنا حکم بتائیں۔ حضرت عائشہ نے کہا: میں کہتی ہوں، تو اولاد آدم میں بہترین ثابت ہو۔ وہ ہر بڑھنے والے کو گراتے رہے، حتیٰ کہ کئی آدمیوں نے یک جا ہو کر انھیں شہید کیا۔ عمرو بن اشرف نے بھی داد شجاعت دی۔ حارث بن زہیر سے مقابلہ ہوا تو دونوں کی جانیں گئیں۔ حضرت علی کی طرف سے حضرت عدی بن حاتم طائی نے حملہ کیا تو ان کی آنکھ پھوٹ گئی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر عسکر کا دفاع کرنے آئے تو اشتر نے ان کے سر پر گہری ضرب لگائی۔ انھوں نے جوابی وار کیا اور دونوں گر پڑے۔ فریقین کے سپاہیوں نے ان کو چھڑایا۔ زفر بن حارث آخری شخص تھا جس کے ہاتھ میں زمام تھی۔ اہل جمل منتشر ہوئے اور جیش علی نے اونٹ کا محاصرہ کر لیا۔ اونٹ پر حملہ کرنا ضروری تھا، کیونکہ حضرت عائشہ کا کجاوہ تیروں کا نشانہ (target) بن چکا تھا۔ اس میں اتنے تیر پیوست ہو چکے تھے جتنے خار پشت کی پشت پر کانٹے ہوتے ہیں۔ حضرت قعقاع بن عمرو، محمد بن ابوبکر اور حضرت عمار بن یاسر نے سیدہ عائشہ کے کجاوے کی رسیاں کاٹیں اور اسے اٹھا کر لاشوں سے پرے رکھ دیا۔ پردے کے لیے چادریں تان دی گئیں، تسمے کاٹ کر سیدہ عائشہ کا ہودہ اتارا گیا، حضرت علی اور تمام کمانڈروں نے ام المومنین کو سلام کیا اور ان سے عزت و اکرام سے پیش آئے۔ محمد بن ابوبکر نے اپنی بہن کی خیریت دریافت کی کہ آیا انھیں کوئی چوٹ تو نہیں آئی، پھر

انھیں بصرہ لے گئے۔ایک منافق اعین بن ضبیعہ نے ہودے میں جھانک کر کہا: میں حمیرا کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ بصرہ میں بری موت مرا۔حضرت علی نے ہدایت دی کہ جنگ سے بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے، زخمی پر وار نہ کیا جائے اور گھروں میں نہ گھسا جائے۔انھوں نے میدان جنگ سے ملنے والی جیش عائشہ کی اشیا کو بصرہ کی مسجد میں پہنچانے اور اسلحہ کو سرکاری خزانہ میں جمع کرانے کا حکم دیا۔حضرت علی کے کچھ ساتھیوں نے حضرت طلحہ وحضرت زبیر کی فوج سے حاصل ہونے والا مال ومتاع بانٹنے کو کہا، لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور کہا: ان کی جانیں اور اموال ہم پر حرام ہیں۔کیا تم چاہتے ہو کہ ام المومنین تمھارے حصے میں آئیں؟ اس کے بجائے انھوں نے بیت المال سے ہر شخص کا حصہ پانسو درہم مقرر کیا۔

جنگ جمل میں طرفین کے دس ہزار اہل ایمان نے زندگی سے ہاتھ دھوئے۔شہدا کی تعداد اس طرح بیان کی گئی ہے، جیش علی: پانچ ہزار، اصحاب عائشہ: پانچ ہزار، بنوضبہ: ایک ہزار، بنوعدی: ستر۔ جنگ میں زخمی ہونے والوں کا کوئی شمار ہی نہ تھا۔شہر میں داخل ہونے کے بعد حضرت علی جنگ جمل میں شہادت پانے والے عبداللہ بن خلف کے گھر گئے جہاں حضرت عائشہ مقیم تھیں۔حضرت عائشہ نے انھیں خوش آمدید کہا، جب کہ عبداللہ بن خلف کی اہلیہ صفیہ انھیں دیکھ کر بین کرنا شروع ہو گئی۔اس نے کہا: اللہ تمھارے بیٹوں کو اسی طرح یتیم کر دے، جیسے تو نے میرے بیٹوں کو یتیم کیا ہے۔عبداللہ بن خلف حضرت عائشہ کی فوج میں شامل تھے، جب کہ ان کے بھائی عثمان بن خلف حضرت علی کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔حضرت علی نے کوئی جواب نہ دیا، ایک شخص نے خاموشی کا سبب پوچھا تو کہا: صفیہ ہمارے ساتھ بری طرح پیش آئی ہے، میں نے اسے اس وقت دیکھا تھا، جب بچی تھی۔عورتیں کم زور ہوتی ہیں۔ ہمیں مشرکہ عورتوں سے اعراض کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یہ تو مسلمان ہیں۔

حضرت عائشہ اپنے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیر سے بہت محبت کرتی تھیں اور ان کے لیے بہت دعا کرتی تھیں۔ جنگ جمل میں حضرت عبداللہ بن زبیر شدید زخمی ہوئے۔انھوں نے اس شخص کو دس ہزار درہم دیے جس نے ان کے بچ جانے کی خبر سنائی اور سجدۂ شکر ادا کیا۔حضرت عبداللہ زخمی ہونے کے بعد وزیر ازدی کے گھر میں تھے۔ انھوں نے حضرت عائشہ کو خبر کرنے کے لیے وزیر کو بھیجا، ساتھ ہی تاکید کی کہ محمد بن ابوبکر کو نہ بتانا۔پھر بھی حضرت عائشہ نے محمد ہی کو بھیجا کہ حضرت عبداللہ کو عبداللہ بن خلف کے گھر لے آؤ۔دونوں ایک دوسرے کو گالیاں دیتے اور برا بھلا کہتے ہوئے آئے۔حضرت عائشہ نے جنگ میں طرفین کی طرف سے شہادت پانے والوں کی تفصیل دریافت کی اور سب کے لیے دعائے مغفرت کی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جنگ کے اختتام پر اشتر نے حضرت عائشہ کو سات سو درہم کا اونٹ خرید کر بھیجا اور کہا: یہ آپ کے اونٹ عسکر کے عوض میں ہے۔ حضرت عائشہ نے اونٹ واپس کر دیا اور کہا: تو نے محمد بن طلحہ کو قتل کیا اور میرے بھتیجے عبداللہ کو زخمی کیا۔ اشتر نے کہا: وہ میری جان لینے کے درپے تھے، میں کیا کرتا۔ مروان حضرت عائشہ کے ساتھ اسی گھر میں ٹھیرا، پھر انھی کے ساتھ بصرہ سے نکلا اور مدینہ روانہ ہو گیا۔

یکم رجب ۳۶ھ، سنیچر کا دن تھا جب حضرت علی نے سیدہ عائشہ کو سواریاں، ساز وسامان دے کر بڑے اہتمام کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ کیا۔ ان کے بھائی محمد بن ابوبکر اور بصرہ کی چالیس معزز عورتوں کو ان کے ساتھ چلنے کو کہا۔ بوقت رخصت حضرت علی دروازے پر کھڑے تھے۔ حضرت عائشہ باہر نکلیں، حاضرین کو الوداع کہا، ان کے لیے دعائے خیر کی اور نصیحت فرمائی: بچو! ایک دوسرے سے رنجور نہ ہونا۔ علی سے میری رنجش اتنی ہی تھی، جتنی ایک عورت کی سسرال والوں سے ہوتی ہے۔ وہ میری خفگی کے باوجود بہت خیر رکھنے والے ہیں۔ حضرت علی ان کے ساتھ کئی میل تک چلے اور ان کے بیٹوں نے دن بھر ان کا ساتھ دیا۔ حضرت عائشہ بصرہ سے مکہ پہنچیں اور حج کرنے کے بعد مدینہ واپس روانہ ہو گئیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت عائشہ نے شیخین کے عہد ہاے خلافت میں کبھی سیاسی امور میں حصہ نہیں لیا۔ حضرت عثمان کے پہلے چھ سال بھی امن وسکون سے گزرے، لیکن بعد میں جب کچھ لوگوں کو خلیفۂ سوم سے شکایات پیدا ہوئیں تو وہ ام المومنین ہونے کی حیثیت سے اپنا نقطۂ نظر حضرت عائشہ کے گوش گزار کرتے۔ حضرت عائشہ سب کو صبر وتحمل کی تلقین کرتیں اور کسی گروہ بندی میں حصہ نہیں لیا۔ جنگ جمل میں حصہ لینے کو اپنی اجتہادی غلطی سمجھتی تھیں جس کا انھیں عمر بھر قلق رہا۔ جب وہ 'وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ'، ''اے ازواج نبی! اپنے گھروں میں ٹک کر رہو'' (الاحزاب ۳۳:۳۳) کی آیت تلاوت کرتیں تو رونے لگتیں، حتیٰ کہ ان کی اوڑھنی بھیگ جاتی۔

حضرت علی کو معلوم ہوا کہ دو شخص حضرت عائشہ کو گالیاں نکال رہے ہیں تو انھوں نے ان کو سو سو کوڑے لگانے کا حکم دیا۔

حضرت عائشہ حج کے بعد مکہ سے لوٹیں تو حضرت اسید بن حضیر ان کے ساتھ تھے۔ حضرت اسید کو اپنی بیوی کی موت کی خبر ملی تو رنجیدہ ہو گئے۔ حضرت عائشہ نے کہا: ابو یحییٰ، اللہ آپ پر رحم کرے۔ آپ ایک عورت کی وفات پر اس قدر غم زدہ ہو گئے ہیں، حالاں کہ آپ کے چچا زاد سعد بن معاذ پر ایسی موت آئی ہے کہ عرش الٰہی ہل گیا ہے۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، الجامع المسند الصحیح المختصر (بخاری، شرکۃ

دارالارقم)،المسند الصحیح المختصر من السنن (مسلم،شرکۃ دارالارقم)،تاریخ الامم والملوک (طبری)،الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)،المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)،الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)،اسدالغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)،سیر اعلام النبلاء (ذہبی)،البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)،الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (مقالہ،امین اللہ وثیر)،Wikipedia, the free encyclopedia۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مقالات

ڈاکٹر عرفان شہزاد

زکوٰۃ: ایک مطالعۂ نو؛ فقہی قیود اور ان کے نتائج

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وحی، خدا کی وہ عظیم نعمت ہے جو انسان اور اس کے سماج سے متعلق ایسے مستقل نوعیت کے معاملات میں متعین رہنمائی کرتی ہے جن کا کوئی معین حل نکالنا یا بالاتفاق کسی حتمی نتیجے تک پہنچنا عقلِ انسانی کے لیے ممکن نہیں، اور اسی وجہ سے وہ محل نزاع و بحث بنے رہتے ہیں۔ ان میں ایمانیات سے لے کر سماجی، معاشی اور سیاسی معاملات تک سے متعلق متعین اور قطعی رہنمائی خدا کی آخری وحی، قرآن مجید کے ذریعے سے فراہم کر دی گئی ہے۔

ریاست کا قیام، انسانی سماج کے اجتماعی معاملات اور ان میں پیدا ہونے والے نزاعات کو دور کرنے کا ایک ناگزیر بندوبست ہے۔ ریاست اپنے فرائض و وظائف، جن میں دفاع، قیام امن، ترسیل انصاف سے لے کر عوام کے فلاح و بہبود تک کے سب امور شامل ہیں، کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مال و دولت کی محتاج ہوتی ہے۔ اس کے مستقل حل کے لیے ریاستیں اپنے شہریوں پر ٹیکس اور لگان عائد کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اس ٹیکس کی شرح کتنی ہو، اور یہ کہاں خرچ کیا جانا چاہیے، یہ ہمیشہ سے محل نزاع رہا ہے۔ اہل حکومت نے جہاں ٹیکس وصولی میں زیادتی کی انتہائیں کیں اور اخراجات میں جدتیں پیدا کر کے بے اندازہ اسراف کیے، وہاں بعض اہل فکر نے ٹیکس فری معیشت کے نظریات بھی پیش کیے، نیز ٹیکس کے مصارف پر بھی خود ساختہ پابندیاں تجویز کیں۔ لیکن وحی نے اپنے ماننے والوں کو اس مخمصے سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا دی۔ اس نے مملکت کے شہریوں کے مال میں مقررہ ٹیکس بنام زکوٰۃ کی

شرحیں اور اس کے مصارف، جن میں ریاستی مشینری کے اخراجات اور فرد اور سماج کی بہبود کے تمام امور شامل ہیں، بھی خود مقرر کر دیے۔ ان میں کوئی ردو بدل بغیر کسی انتظامی مجبوری یا اضطرار کے کسی مسلمان حاکم اور عالم کو روا نہیں۔

شریعت کی رو سے ایک مسلم ریاست کے مالی معاملات کے پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ وعشر اور زمین کا کرایہ ہی مستقل آمدن کا ذریعہ ہے۔ عشر بھی پیداوار کی زکوٰۃ ہی ہے۔ اس لیے اس مضمون میں ہم اسے بھی زکوٰۃ کے عموم میں ہی بیان کریں گے۔ مسلم حکومت زکوٰۃ کے علاوہ کوئی اور ٹیکس مسلم عوام کی رضامندی کے بغیر وصول کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔

وحی نے اس ٹیکس کو زکوٰۃ جیسی مذہبی اصطلاح عطا کی، اسے عبادات میں شامل کیا، بلکہ اسے دین کے ایک رکن کی حیثیت دے دی، نماز اور زکوٰۃ، دونوں کو مسلمانیت کی شرط قرار دیا، جس کے بعد ایک مسلمان کسی مسلم ریاست میں حقوق شہریت کا استحقاق پیدا کرتا ہے:

فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوۡا سَبِيۡلَهُمۡ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ. (التوبہ ۹:۵)	’’پھر اگر یہ توبہ کر لیں اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو اِن کی راہ چھوڑ دو۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔‘‘

اسی بنا پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جن لوگوں نے حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا، ان کے خلاف جنگ کی گئی۔

مختلف قسم کے اموال پر زکوٰۃ کی شرحیں اور اس کے مصارف نزول قرآن سے پہلے سے خدا کی شریعت میں ہمیشہ سے معروف اور معلوم رہے ہیں:

وَجَعَلۡنٰهُمۡ اَئِمَّةً يَّهۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡهِمۡ فِعۡلَ الۡخَيۡرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيۡتَآءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوۡا لَنَا عٰبِدِيۡنَ. (الانبیاء ۲۱:۷۳)

اہل کتاب تو اس کی تفصیلات سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے۔ اہل عرب بھی دین ابراہیم کو کافی کچھ بھلا دینے کے باوجود اس سے واقف تھے، اسی بنا پر مکی سورہ میں بھی زکوٰۃ کا ذکر موجود ہے۔ عربوں کے جد امجد اور ان کے پیغمبر حضرت اسمٰعیل کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَاذۡكُرۡ فِى الۡكِتٰبِ اِسۡمٰعِيۡلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ	’’اور اِس کتاب میں اسمٰعیل کا ذکر کرو۔ وہ وعدے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا. وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا. (مریم ۱۹: ۵۴-۵۵)

کا سچا اور رسول نبی تھا۔ وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کی تلقین کرتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک ایک پسندیدہ انسان تھا۔‘‘

سورۂ نمل جو مکی سورہ ہے، اس میں بھی زکوٰۃ کا ذکر ہے:

اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ. (۲۷: ۳)

’’جو نماز کا اہتمام کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہی آخرت پر فی الواقع یقین رکھتے ہیں۔‘‘

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے یہ تجدید پا کرامت کو متواتر سنت کے ذریعے سے حاصل ہوئی ہے۔ قرآن میں زکوٰۃ وصدقات کے مصارف کا ذکر منافقین کے ایک اعتراض کے جواب میں آ گیا ہے، ورنہ وہ بھی اسی طرح معلوم تھے، جیسے زکوٰۃ کی شرحیں، جن کا ذکر قرآن میں نہیں، بلکہ سنت متواترہ میں ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ. (التوبہ ۹: ۶۰)

’’(اِنھیں بتا دو کہ) صدقات تو درحقیقت فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور اُن کے لیے جو اُن کے نظم پر مامور ہوں، اور اُن کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہے۔ نیز اِس لیے کہ گردنوں کے چھڑانے میں اور تاوان زدوں کے سنبھالنے میں اور خدا کی راہ میں اور مسافروں کی بہبود کے لیے خرچ کیے جائیں۔ یہ اللہ کا مقرر کردہ فریضہ ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔‘‘

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شریعت نے تین قسم کے اموال پر تین طرح سے زکوٰۃ عائد کی ہے:

۱۔ مال: سونا چاندی اور دیگر مالیت کی چیزیں۔ ان میں زائد از ضرورت اشیا، حد نصاب سے زیادہ ہونے اور ان کی کل مالیت پر سال میں ایک بار اڑھائی فیصد کی شرح سے زکوٰۃ عائد ہوگی۔

۲۔ پیداوار: زمین کی پیداوار اور اس کے علاوہ پیداوار کی تمام جدید صورتوں میں بھی ہر پیداوار کے موقع پر پانچ، دس اور بیس فیصد کے حساب سے زکوٰۃ عائد ہوگی، جسے عشر اور نصف عشر وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اس کا فارمولہ یہ ہے کہ پیداوار اگر محنت اور سرمائے، دونوں سے وجود میں آئی ہے تو اس کا پانچ فی صد، سرمائے یا محنت میں سے کسی ایک سے وجود میں آئی ہے تو دس فی صد اور ان دونوں کے بغیر پیداوار ہوئی ہے، جیسے کوئی خزانہ نکل آئے، تو اس کا بیس فی صد زکوٰۃ میں دیا جائے گا۔

۳۔مویشی:ا۔اونٹ

۴۔۵سے۲۴تک، ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری،

۵۔۲۵سے۳۵تک، ایک یک سالہ اونٹنی اور اگر وہ میسر نہ ہو تو دو سالہ اونٹ،

۶۔۳۶سے۴۵تک، ایک دو سالہ اونٹنی،

۷۔۴۶سے۶۰تک، ایک سہ سالہ اونٹنی،

۸۔۶۱سے۷۵تک، ایک چار سالہ اونٹنی،

۹۔۷۶سے۹۰تک، دو، دو سالہ اونٹنیاں،

۱۰۔۹۱سے۱۲۰تک، دو، سہ سالہ اونٹنیاں،

۱۱۔۱۲۰سے زائد کے لیے ہر ۴۰ پر ایک دو سالہ اور ہر ۵۰ پر ایک سہ سالہ اونٹنی۔

۱۲۔ب۔گائیں

۱۳۔ہر ۳۰ پر ایک یک سالہ اور ہر ۴۰ پر ایک دو سالہ بچھڑا۔

۱۴۔ج۔بکریاں

۱۵۔۴۰سے۱۲۰تک، ایک بکری،

۱۶۔۱۲۱سے۲۰۰تک، دو بکریاں،

۱۷۔۲۰۱سے۳۰۰تک، تین بکریاں،

۱۸۔۳۰۰سے زائد میں ہر ۱۰۰ پر ایک بکری۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دور جدید نے پیداوار کی بہت سے نئی صورتیں پیدا کر دی ہیں، جن میں صنعتی پیداوار، تنخواہ، پینشن، کمیشن، اور مختلف خدمات کی فیسیں وغیرہ شامل ہیں، جو روزانہ، ہفتانہ اور ماہانہ بنیادوں پر پیدا ہوتی ہیں۔ فقہا نے انھیں مال میں شامل کیا ہے، یعنی اخراجات کے بعد ان میں سے جو بچ جائے، اس پر سال میں ایک دن مقرر کر کے اڑھائی فی صد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے، لیکن غور کیجیے کہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ اصلاً پیداوار ہی ہیں، چنانچہ ان پر پیداوار کی زکوٰۃ عائد ہونی چاہیے، انھیں مزروعات، یعنی زمین کی فصل کی پیداوار پر قیاس کرنا ہی درست ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جیسے ہی یہ وصول ہوں، ان پر پانچ، دس اور بیس فی صد زکوٰۃ عائد ہو جائے گی۔ ان کی بچت انھیں الگ سے مال بھی بناتی ہے، جس پر سال میں ایک بار الگ سے اڑھائی فی صد کے حساب سے زکوٰۃ عائد ہوتی ہے۔ اس کے لیے حد نصاب کا مقرر کرنا حکومت کا اختیار ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وقت میں جو نصاب مقرر کیا تھا، وہ

ایک نمونہ ہے کہ نصاب مقرر کرتے ہوئے کن امور کا خیال کرنا چاہیے۔حکومت کا یہ بھی اختیار ہے کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق قابل زکوٰۃ اشیا میں سے کسی چیز کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دے دے یا اس پر زکوٰۃ کی شرح کم عائد کر دے، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں گھوڑوں اور سبزیوں کو بوجوہ مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔

دیکھا جا سکتا ہے کہ اگر ایک مسلم حکومت، مال اور پیداوار کی ان تمام مدات سے زکوٰۃ کی وصولی کرے، تو عمومی حالات میں اسے مزید کوئی ٹیکس لگانے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور ٹیکس کی شرح میں زیادتی کے عوامی شکوے، اور ردعمل میں ٹیکس چوری کا اخلاقی جواز بھی ختم ہو جائے گا۔معاملہ ملکی قانون کے علاوہ شریعت، اخلاق اور ضمیر کی عدالت میں آجائے گا۔

جب تک حکومت اس پر عمل پیرا نہیں ہوتی، تب تک، البتہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ حکومت جتنا ٹیکس تنخواہوں اور پراپرٹی ٹیکس وغیرہ پر کاٹ لیتی ہے، مسلمان اپنے اموال اور پیداوار کا حساب لگا کر اتنا حصہ اپنی زکوٰۃ میں سے منہا کر لیں۔ اگر ٹیکس میں کٹنے والی رقم زکوٰۃ کی مقدار سے کم ہے تو باقی کی زکوٰۃ وہ خود ادا کر دیا کریں، اور اگر ٹیکس میں محسوب ہونے والی رقم زیادہ ہے تو اس زائد کٹ جانے والی رقم کو سماج کے اجتماعی کاموں میں اپنی طرف سے عام صدقہ سمجھیں اور عنداللہ اجر و ثواب کی امید رکھیں۔معلوم ہونا چاہیے کہ زکوٰۃ وہ کم سے کم مقدار ہے جسے ایک مسلمان کو خدا کے دیے ہوئے مال میں سے خدا کی راہ میں خرچ کرنا ضروری ہے، لیکن مکارم اخلاق کا تقاضا ہے کہ خدا کی راہ میں وسعت سے خرچ کیا جائے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmedghamidi.com

نماز اور زکوٰۃ، دونوں کا انتظام ایک مسلم حکومت کے فرائض میں شامل ہے۔تاہم بدقسمتی سے مسلم حکومتیں اپنے ان فرائض سے عموماً غافل ہیں۔نماز اور زکوٰۃ کا معاملہ چونکہ فرد کی عبادت کا معاملہ ہے اور ریاست اس کی اجتماعی سطح پر جمع و تقسیم کرنے میں معاون کا کردار ادا کرتی ہے، اس لیے ریاست کے بندوبست کی عدم موجودگی میں مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ جیسے انھوں نے خود سے باجماعت نماز، مساجد، جمعہ اور عیدین کا انتظام کامیابی سے قائم کیا ہے، اسی طرح زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا انتظام بھی کریں۔اس کے لیے ایسی تمام تنظیمیں اور ادارے جو عوامی، فلاحی اور تعمیری کاموں میں مصروف ہیں، کو زکوٰۃ ادا کر کے اس فریضہ کی ادائیگی کرنی چاہیے۔

زکوٰۃ پر فقہی قیود اور ان کے نتائج

یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں تھی کہ زکوٰۃ فقرا و مساکین وغیرہ کی بہبود کے لیے وضع کی گئی ہے۔لیکن ہمارے فقہا نے

نصاب زکوٰۃ اور فقیر کی تعریف میں ایسی پر تکلف شرائط اور فقہی قیود پیدا کر دی ہیں جو نہ صرف زائد از ضرورت قانون سازی معلوم ہوتی ہے، بلکہ اس سے بہت سے حقیقی ضرورت مند، فقیر و مسکین کے زمرے سے خارج قرار پائے ہیں۔ یہ قیود شریعت کو ریاضیاتی منطقی اصولوں پر برتنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔

مسلم حکومتوں کی عدم توجہی کی وجہ سے زکوٰۃ جیسے اہم ستون سے سماج کو کماحقہٗ فائدہ حاصل نہیں ہو رہا۔ ریاستی اداروں کے متبادل کے طور پر جو نجی کی (پرائیویٹ) تنظیمیں سماج کی فلاح کے لیے مسلمانوں کے مالی تعاون کو مربوط انداز میں استعمال کرنے کی صلاحیت کے ساتھ برسر عمل ہیں، ان کی افادیت اور دائرۂ عمل کو بھی زکوٰۃ سے متعلق فقہی قواعد و ضوابط نے نہایت محدود اور غیر موثر کر دیا ہے۔ انھیں بہت سے تکلفات برتنے پڑتے ہیں، جس سے نہ صرف ان کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے، بلکہ بعض اوقات صورت حال مضحکہ خیز ہو جاتی ہے، مثلاً حیلۂ تملیک کیا جاتا ہے جس میں زکوٰۃ کی رقم کسی شخص کے سپرد یا مدارس میں عموماً کسی نوبالغ طالب علم (کیونکہ اس کے لیے بالغ ہونا شرط ہے، جسمانی بلوغت کے ساتھ عاقل ہونا لازم سمجھ لیا گیا ہے) کے حوالے کر کے اسے برائے نام مالک بنا دیا جاتا ہے اور پھر اسے ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ اپنی ''مرضی'' سے اتنے سارے پیسے تنظیم یا مدرسے کو دے دے۔ اس بے جا قانون سازی سے شریعت ایک مذاق بن جاتی ہے، یا پھر یہ محسوس ہوتا ہے کہ شریعت سماج کے لیے مفید ہونے کے بجائے اس کی فلاح و بہبود میں رکاوٹیں کھڑی کرتی ہے۔ آگے کی سطور میں ہم یہ دیکھیں گے کہ شریعت کی پوزیشن واقعی یہی ہے یا فقہی تعبیرات اور قواعد نے اس کی یہ پوزیشن بنا دی ہے۔ ان فقہی قیود کا ایک نمونہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے، جس کے بعد دیکھا جا سکتا ہے کہ خود زکوٰۃ کی مد کس حد تک سماج کی بہبود میں مفید رہ جاتی ہے:

i۔ پہلی شرط یہ لگائی گئی ہے کہ زکوٰۃ کی تملیک کی جائے۔ یعنی ضرورت مند کو زکوٰۃ کی رقم یا چیز کا مالک بنانا ضروری ہے، حقیقی ضرورت مند سامنے نہ ہو تو ضرورت مندوں کے مجاز وکیل کو ادا کرنے سے زکوۃ ادا ہو گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کو مفت سروسز کی شکل استعمال نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کسی ایسے اجتماعی بہبود کے کام میں صرف کیا جا سکتا ہے جس کا کوئی شخصی مالک نہیں ہو سکتا۔ مالکانہ تصرف کے بغیر، مثلاً کھانا کھلانا بھی درست نہیں، خیراتی ہسپتال میں غربا کا علاج معالجہ جس میں علاج کا خرچ مریض کو دینے کے بجائے براہ راست ہسپتال کو دیا جائے یا بے گھر افراد کی رہایش کے لیے بلا ملکیت مفت یا رعایتی کرایے پر رہایش کا بندوبست کرنا بھی جائز نہیں، یا غربا کو کوئی ایسا ذریعۂ آمدن مہیا کرنا جس میں مالکانہ اختیار نہ ہو، اسی طرح مردہ کا کفن دفن کرنا، کوئی کنواں، واٹر فلٹر پلانٹ یا اسی قسم کا اجتماعی بہبود کا کوئی فلاحی کام کرنا جس میں کوئی شخص مالک نہیں ہوتا، یہ سب زکوٰۃ کے فنڈ سے کرنا درست نہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مساجد کی تعمیر میں، کسی مرنے والے کے قرض کی ادائیگی میں بھی زکوٰۃ کا پیسا استعمال نہیں ہوسکتا، وغیرہ۔یعنی زکوٰۃ میں کسی حاجت مند کواس کا مالک بنانا ضروری ہے۔

ii۔اسی طرح زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا بندوبست کرنے والی کوئی تنظیم اپنے ملازمین کو زکوٰۃ کے فنڈ سے تنخواہ بھی نہیں دے سکتی، کیونکہ زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم اصلاً حکومت کا کام ہے، وہی غربا کی مجاز وکیل ہے۔ جو تنظیمیں اپنے طور پر یہ کام کررہی ہیں، انھیں یہ کام رضا کارانہ ہی کرنا ہوگا یا ان کی تنخواہ زکوٰۃ کے علاوہ کسی اور فنڈ سے ادا کی جائے۔

iii۔حاجت مند سید اور ہاشمی نہ ہو۔

iv۔حاجت مند غیر مسلم نہ ہو۔

v۔حاجت مند کے پاس سونا چاندی، رقم، مال تجارت اور زائد از ضرورت کوئی چیز، مثلاً پلاٹ، دکان، ٹی وی، موبائل فون، ضرورت سے زائد سواری، کپڑے جوتے وغیرہ نہ ہوں جو حد نصاب کو پہنچیں۔نصاب کی حد چاندی کے نصاب ۶۴۲ گرام ہے

vi۔حاجت مند نے کوئی کمیٹی ڈالی ہوئی نہ ہو کہ وہ قابل وصول قرض میں آجاتی ہے۔اگر یہ بھی حد نصاب کے مساوی نہ ہو، ورنہ فقیر و مسکین کی تعریف سے خارج ہو جائے گا۔

vii۔پراویڈنٹ فنڈ حد نصاب کے برابر نہ ہو کہ وہ بھی قابل وصول قرض کی مد میں آجاتا ہے۔

اگران میں سے کوئی بھی چیز پائی جائے تو ایسا شخص ضرورت مند ہوتے ہوئے بھی زکوٰۃ کا مستحق نہیں ہے۔اس کی مدد ضروری ہو تو زکوٰۃ کے علاوہ دیگر نفلی صدقات سے کی جاسکتی ہے، لیکن زکوٰۃ کی مد سے نہیں کی جاسکتی۔

معاشرے قانون اور اخلاق، دونوں کی مدد سے چلتے ہیں۔قانون سے وہ کم سے کم معیار حاصل کیا جاتا ہے جو معاشرے کی بقا کے لیے ضروری ہوتا ہے۔زکوٰۃ قانونی معاملہ ہے۔یہ وہ کم سے کم حق ہے جس کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ تو بس خدا کے راستے میں خرچ کرنے کی ترغیب ہی دی جاسکتی ہے، مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔درج بالا فقہی قیود کے بعد دیکھا جاسکتا ہے کہ زکوٰۃ کا دائرہ اس قدر محدود ہو جاتا ہے کہ فقہی تعریف پر پورا نہ اترنے والے حاجت مندوں اور اجتماعی نوعیت کے فلاحی کاموں کے لیے رقم کا بندوبست کرنے کے لیے مسلمانوں کے نظم اجتماعی (حکومت) کے لیے زکوٰۃ کے علاوہ بھی ٹیکس لگانا ناگزیر ہو جاتا ہے، جب کہ ایک مسلم حکومت زکوٰۃ کے علاوہ کوئی اور ٹیکس عائد کرنے کی مجاز نہیں، یا پھر ان کاموں کے لیے عوام سے اپیلیں کرنا پڑتی ہیں۔''زکوٰۃ اسلامی معاشرے کے لیے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہے، لیکن اگر یہ واقعہ ہے کہ اس کے ذریعے سے کوئی اجتماعی نوعیت کا کام نہیں کیا جاسکتا

اورغریبوں کی مجموعی بہبود کی اسکیمیں اس سے بروے کار نہیں لائی جاسکتیں، بلکہ ختم کی دیگ کی طرح اس کا وہیں تقسیم کر دیا جانا لازمی ہے جہاں یہ پکائی گئی ہے تو اس کی افادیت کم از کم موجودہ زمانہ کے اقتصادی ماحول میں تو بمنزلۂ صفر ہو کے رہ جاتی ہے۔'' (مسئلۂ تملیک، مولانا امین احسن اصلاحی ۱۲)

مسئلۂ تملیک

ہمارے فقہا زکوٰۃ میں تملیک کی شرط عائد کرتے ہیں، بلکہ وہ اسے زکوٰۃ کا رکن قرار دیتے ہیں۔ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی لکھتے ہیں:

''''تملیک فقیر'' زکوٰۃ کے لیے شرط ہی نہیں، بلکہ رکن ہے، بلکہ زکوٰۃ کی حقیقت ہی ''تملیک فقیر'' ہے۔ زکوٰۃ میں تملیک کا ضروری ہونا متفق علیہ ہے۔ کسی امام کا اس میں اختلاف بیان نہیں کیا گیا، بلکہ امام شافعی کی طرف تو یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ ان کے نزدیک 'اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ' میں 'لام' ملک کے لیے ہے۔''

(مسئلۂ تملیک، مولانا امین احسن اصلاحی ۸)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حیرت اس پر ہے کہ تملیک کے اس استدلال کے لیے دین وشریعت میں کوئی ماخذ موجود نہیں۔ اِس وجہ سے ہمارے نزدیک زکوٰۃ جس طرح فرد کے ہاتھ میں دی جاسکتی، اُسی طرح اُس کی بہبود کے کاموں میں بھی خرچ کی جاسکتی ہے۔

تملیک کے استدلال پر زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کہا جا سکا ہے تو وہ یہ ہے کہ سورہ توبہ (۹) کی آیت ۶۰ میں 'لِلۡفُقَرَآءِ' میں لام تملیک یا عاقبت، یعنی انجام فعل کے لیے آیا ہے جو تملیک کا ہی فائدہ دیتا ہے، یعنی زکوٰۃ فقرا و مساکین کی ملک بنانے کے لیے ہے یا زکوٰۃ اس لیے ہے کہ فقرا و مساکین وغیرہ کو دی جائے تاکہ وہ اس کے مالک بن سکیں۔ دوسری دلیل یہ دی گئی ہے کہ 'ایتاء' اور 'تصدق'، یعنی دینا یا صدقہ کرنا، اس کا نتیجہ تملیک ہی ہوتا ہے، جب آپ کسی کو کچھ دیتے ہیں تو تملیک کر دیتے ہیں۔

گویا، ہم کہہ سکتے ہیں کہ تملیک کا یہ استدلال ایک فقہی استنباط ہے۔ قرآن وسنت یا حدیث میں اس کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی اس پر استدلال درست نہیں۔ آپ اور آپ کے عمال زکوٰۃ کی وصولی کے بعد اکثر اسے فوراً تقسیم کر دیتے یا یہ بیت المال میں لا کر تقسیم کر دی جاتی تھی۔ اُس دور میں زکوٰۃ کا مال زیادہ تر اجناس ہوتی تھیں۔ ان کا مصرف یہی تھا کہ جلد ہی مستحقین کے حوالے کر دی جائیں۔ نیز تمام محاصل

بیت المال میں جمع کیے جاتے تھے، لیکن ایسی کوئی تصریح نہیں ملتی کہ زکوٰۃ کے محصول کو الگ رکھا اور برتا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ زکوٰۃ کی تملیک کرنا کوئی شرعی قاعدہ ہے، نہ اس کا کوئی قانونی بیان موجود ہے۔

انصاف کا تقاضا ہے کہ ایک استنباط کو استنباط ہی کی حیثیت سے پیش کرنا چاہیے، جو درست بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی، اسے اس مسئلہ کی واحد شرعی تعبیر کی صورت میں پیش کرنا حد سے تجاوز ہے۔ دوسری بات یہ کہ کوئی اگر دلیل کی بنیاد پر اس سے اختلاف کرے تو اسے شریعت سے انحراف نہیں سمجھا جاسکتا۔

اس بارے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ سورۂ توبہ کی آیت مذکورہ میں آنے والا لام دو وجہ سے تملیک کے لیے نہیں ہے: ایک تو اس لیے کہ لام کے دیگر استعمالات بھی ہیں، اسے لام تملیک قرار دینے کے لے جو مضبوط قرینہ درکار ہے، وہ یہاں دستیاب نہیں۔ بلکہ سیاق وسباق اس کے خلاف جاتے ہیں۔ متعلقہ آیت اپنے سیاق وسباق کے ساتھ ملاحظہ کیجیے:

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّلۡمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ فَاِنۡ اُعۡطُوۡا مِنۡهَا رَضُوۡا وَاِنۡ لَّمۡ يُعۡطَوۡا مِنۡهَاۤ اِذَا هُمۡ يَسۡخَطُوۡنَ. وَلَوۡ اَنَّهُمۡ رَضُوۡا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ وَقَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ سَيُؤۡتِيۡنَا اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ وَرَسُوۡلُهٗۤ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوۡنَ. اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡعٰمِلِيۡنَ عَلَيۡهَا وَالۡمُؤَلَّفَةِ قُلُوۡبُهُمۡ وَفِى الرِّقَابِ وَالۡغٰرِمِيۡنَ وَفِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ.

(التوبہ ۹: ۵۸-۶۰)

''اِن میں ایسے بھی ہیں، (اے پیغمبر) جو صدقات (کی تقسیم) کے معاملے میں تم پر عیب لگاتے ہیں۔ (یہ وہ لوگ ہیں جنھیں لالچ نے تمھارے ساتھ باندھ رکھا ہے)۔ چنانچہ اگر اُس مال میں سے اِنھیں دیا جائے تو راضی رہتے ہیں اور نہ دیا جائے تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ (اِن کے لیے کہیں بہتر ہوتا)، اگر یہ اُس پر راضی رہتے جو اللہ اور اُس کے رسول نے اِنھیں دیا تھا اور کہتے کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے۔ اللہ آگے اپنے فضل سے ہم کو بہت کچھ دے گا اور اُس کا رسول بھی۔ ہمیں تو اللہ چاہیے۔ اِنھیں بتا دو کہ) صدقات تو درحقیقت فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور اُن کے لیے جو اُن کے نظم پر مامور ہوں، اور اُن کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہے۔ نیز اِس لیے کہ گردنوں کے چھڑانے میں اور تاوان زدوں کے سنبھالنے میں اور خدا کی راہ میں اور مسافروں کی بہبود کے لیے خرچ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کیے جائیں۔ یہ اللہ کا مقرر کردہ فریضہ ہے اور اللہ علیم و
حکیم ہے۔''

''دیکھیے، یہاں اوپر والی آیت میں ذکر ان منافقین کا تھا جن کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسن ظن اور سوء ظن تمام تر اغراض پر مبنی تھا۔ اگر خیرات کے مال میں سے ان کی خواہش کے بقدر انھیں مل جاتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خوب خوب تعریفیں کرتے اور خواہش کے بقدر نہ ملتا تو آپ کو متہم کرنے سے بھی باز نہ رہتے۔ آپ پر بے جا جانب داری اور ناروا پاس داری کا الزام لگاتے اور لوگوں میں طرح طرح کی وسوسہ اندازیاں کرتے پھرتے۔ غور کیجیے کہ اس سیاق میں بتانے کی بات کیا ہو سکتی ہے، یہ کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے کسی فقیر کو اس کا مالک بنانا ضروری ہے یا یہ کہ زکوٰۃ وخیرات کی رقموں کے اصلی حق دار اور مستحق فلاں فلاں قسم کے لوگ ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سیاق میں بتانے کی بات یہ دوسری ہی ہو سکتی ہے، نہ کہ پہلی۔ چنانچہ مفسرین میں سے جن لوگوں کی نظر سیاق وسباق پر رہتی ہے، انھوں نے آیت کی یہی تاویل کی بھی ہے۔ صاحب کشاف 'اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ' کی تاویل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قصر لجنس الصدقات علی الاصناف المعدودة وانها مختصة بها لا تتجاوزها الی غيرها كانه قيل انما هی لهم لا لغيرهم ونحوه قولك انما الخلافة لقريش تريد لا تتعداهم ولا تكون لغيرهم. (الکشاف ۲/۲۶۹)

''یہاں صدقات وزکوٰۃ کو مذکورہ اقسام پر محدود کر دیا گیا ہے اور یہ کہ یہ انھی کے لیے خاص ہے۔ دوسروں کی طرف یہ چیز منتقل نہیں ہو سکتی۔ گویا یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ چیز انھی کے لیے ہے، ان کے ماسوا لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ تم کہو: 'اِنَّمَا الْخِلَافَةُ لِقُرَيْشٍ' (خلافت تو بس قریش کے لیے ہے) یعنی یہ ان کے سوا دوسروں کا حق نہیں ہے۔''' (مسئلۂ تملیک، مولانا امین احسن اصلاحی ۱۹-۲۰)

دوسرا یہ کہ عطا یا صدقہ کرنے سے تملیک کرنا لازمی نہیں ہو جاتا۔ مثلاً کھانا پکا کر کھلانا، یا حاجت مندوں کے مفت علاج کے لیے خدمات مہیا کرنا۔ یہ بھی دوسروں پر 'ایتاء' اور 'تصدق' ہی دینا اور صدقہ کرنا ہی ہے اور اس میں شخصی تملیک بھی نہیں۔ اگر حقیقت میں ایسا ہوتا تو 'اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ' (اور ہم نے ان کو کتاب دی)، اور 'اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا' (اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی) میں تملیک کا مفہوم لینا پڑتا جو کہ درست نہیں۔ (ملخص مسئلۂ تملیک، مولانا امین احسن اصلاحی ۲۳)

تیسری وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں پہلے چار مصارف زکوٰۃ حرف لام کے تحت آئے ہیں، لیکن بقیہ چار حرف 'فِیْ'

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کے ساتھ آئے ہیں۔'فی' میں تملیک کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اس میں افادیت اور خدمت و مصلحت کا مفہوم پایا جاتا ہے،جیسا کہ حدیث میں ہے: 'واللّٰہ في عون العبد ما کان العبد في عون أخیہ' (جب تک کہ ایک مسلمان اپنے بھائی کے کام میں یا اس کے مصالح کی خدمت میں لگا رہتا ہے، اللہ اس کے مصالح میں اس کی مدد کرتا رہتا ہے)۔چنانچہ پوری آیت کی ایسی تاویل ہی درست ہوسکتی ہے جو لام اور 'فی' کے مدلول میں کوئی تضاد پیدا نہ کرے۔یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ پہلے چار مصارف میں تو تملیک سمجھی جائے اور دوسری چار میں تملیک نہ سمجھی جائے۔ اس بنا پر لام کا بھی وہی مطلب درست ہوسکتا ہے جو 'فی' کے مخالف نہ ہوں، اور لام کے استعمالات میں یہ مفہوم موجود ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں لام استحقاق کے مفہوم کے لیے ہے یا انتفاع و افادہ کے مفہوم کے لیے۔یعنی زکوٰۃ فقرا و مساکین وغیرہ کی فلاح و بہبود کے لیے ہے۔کلام کا سیاق و سباق بھی جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا، اسی کی تائید کرتا ہے۔(ملخص مسئلۂ تملیک، مولانا امین احسن اصلاحی ۱۲۰-۱۲۱)

چوتھی دلیل یہ ہے کہ یہاں 'الصَّدَقٰت' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس میں زکوٰۃ اور عام صدقات، سب شامل ہیں۔ یہ دراصل حکومت کو حاصل ہونے والا ریونیو ہے، نہ کہ محض زکوٰۃ۔ یہ مصارف بھی صرف زکوٰۃ کے نہیں، بلکہ تمام صدقات کے ہیں۔عام صدقات میں تملیک فقیر کو ضروری نہیں سمجھا گیا، زکوٰۃ کے معاملے میں بھی یہ ضروری نہیں سمجھا جائے گا۔

یہ مسئلہ حل ہوجانے کے بعد وہ تمام فقہی تکلفات برتنے کی ضرورت ختم ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے ایک طرف تو زکوٰۃ کے انتظامات کرنے والے اداروں کو نہایت درجے انتظامی مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے، اور دوسری طرف بہت سے اجتماعی نوعیت کے ایسے فلاحی کام بھی وجود پذیر نہیں ہو پاتے جن میں فرد کی تملیک ممکن نہیں ہوتی اور پھر ان کے لیے الگ سے ٹیکسز یا اپیلیں کرنی پڑتی ہیں۔اسی طرح حاجت مندوں کو مفت سروسز بھی فراہم کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہتی۔تملیک کی شرط کے بغیر زکوٰۃ کے زیادہ وسیع پیمانے پر استعمال سے عوامی بہبود زیادہ موثر طریقے سے ممکن ہے۔خدا کے دین کا منشا بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

مصارف زکوٰۃ

سورۂ توبہ کی آیت ۶۰ میں جو لفظ 'الصَّدَقٰت' استعمال ہوا ہے۔اس میں عام صدقات کے علاوہ زکوٰۃ بھی شامل ہے۔ یہ دراصل مملکت کا وہ تمام ریونیو ہے جو مملکت کو حاصل ہوتا ہے۔اس لحاظ سے زکوٰۃ اور دیگر صدقات کے مصارف میں کوئی فرق نہیں ہے۔

i۔ فقیر و مسکین

مصارف زکوٰۃ میں فقیر اور مسکین کی تعریف میں اہل علم نے اختلاف کیا ہے، لیکن یہ بات مشترک ہے کہ دونوں سے مراد سماج کے حاجت مند طبقات ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کی سادہ تعریف یہ ہے:

''فقیر سے وہ لوگ مراد ہوتے ہیں جو کمانے، ہاتھ پاؤں مارنے، زندگی کے لیے جدوجہد کرنے کا دم داعیہ تو رکھتے ہیں، لیکن مالی احتیاج ان کے راستہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہوتی ہے۔ اور مسکین سے وہ طبقہ مراد ہوتا ہے جو مسلسل غربت اور احتیاج کا شکار رہنے کے سبب سے جدوجہد کرنے اور مشکلات پر قابو پانے کا حوصلہ ہی کھو بیٹھتا ہے اور اس کے اوپر دل شکستگی اور مسکنت طاری ہو جاتی ہے۔

زکوٰۃ کا اولین مصرف یہ ہے کہ سوسائٹی کے ان دونوں طبقات کو اٹھانے کی کوشش کی جائے۔ اس اٹھانے میں جس طرح یہ بات شامل ہوگی کہ ان کی جسمانی ضروریات کھانا، کپڑا، اور مسکن فراہم کی جائیں، اسی طرح ان کی عقلی اور اخلاقی ترقی کے لیے یہ بھی ضروری ہوگا کہ ان کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا جائے۔ جس طرح یہ لازمی ہے کہ ان کی وقتی احتیاج رفع کی جائے، اسی طرح یہ بھی غالباً ضروری ہے کہ ان کو مفلسی اور بدحالی کی دلدل سے نکالنے کی مستقل تدبیریں اختیار کی جائیں تاکہ وہ اپنی ذاتی جدوجہد اور اپنی ذاتی صلاحیتوں کے بل بوتے پر سوسائٹی کے اندر باعزت زندگی بسر کر سکیں اور مستقلاً دوسروں پر بار بنے رہنے کے بجائے دوسروں کے بوجھ اٹھانے کے قابل ہو سکیں۔ ان مقاصد کے پیش نظر زکوٰۃ کی مد سے ان کے لیے روٹی، کپڑا اور مکان بھی مہیا کیا جا سکتا ہے، ان کے لیے تعلیمی اور تربیتی ادارے بھی کھولے جا سکتے ہیں، ان کے لیے دارالمطالعے اور کتب خانے بھی قائم ہو سکتے ہیں، ایسے صنعتی ادارے بھی ان کے لیے جاری کیے جا سکتے ہیں، جن میں ان کے بچے مختلف قسم کی صنعتیں سیکھ کر مستقبل میں اپنے اوپر اعتماد کرنے کے قابل بن سکیں۔ اسی طرح ان کے علاج کے لیے ایسے شفاخانے بھی کھولے جا سکتے ہیں جہاں بوقت ضرورت ان کو مفت دوا حاصل ہو سکے۔ جہاں ان کی عورتوں کو ولادت کے موقع پر مفت طبی امداد حاصل ہو سکے۔ علیٰ ہذا القیاس، ان کے مردوں کی تجہیز و تکفین کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے اور ان کے زندوں اور مردوں کے قرضے بھی ادا کیے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض صورتوں میں تملیک ہوگی، بعض صورتوں میں نہیں ہوگی، لیکن زکوٰۃ کا نفع ہر صورت میں اصلاً غربا ہی کو پہنچے گا یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اجتماعی تملیک بہرحال غربا ہی کی ہوگی۔ اور اوپر ہم بتا چکے ہیں کہ اگر استدلال کی بنیاد 'ایتاء' کے لفظ پر ہے تو یہ لفظ اجتماعی تملیک کے لیے قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔'' (مسئلۂ تملیک، مولانا امین احسن اصلاحی ۳۷-۳۸)

فقہی ضوابط کی بے جا قانون سازی نے صورت حال یہ پیدا کر دی ہے کہ جب تک کوئی شخص مفلسی کی آخری حد

نہ چھو لے، ہمارے فقہا کے نزدیک زکوٰۃ کا مستحق قرار نہیں پاتا۔ آج ہم جس سماج میں رہتے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ موبائل فون اور ٹی وی، جیسی چیزیں ضروریات میں شامل ہو چکی ہیں، لیکن ہمارے فقہا ابھی تک انھیں ضروریات کے زمرے میں شامل کرنے پر تیار نہیں۔

ٹی وی کے معاملے کو دیکھیے، اس کے تین بڑے مقاصد ہیں: تفریح، تعلیم اور معلومات تک رسائی۔ یہ تینوں چیزیں انسان کی بنیادی ضرورت ہیں۔ اگر طلبا کی تعلیم پر خرچ کرنا زکوٰۃ کا جائز مصرف ہے تو ٹی وی بھی اب یہی کردار ادا کر رہا ہے۔ ٹی وی کی اسی افادیت کی بنا پر علما اب خود بھی درس اور وعظ کے لیے اس پر رونق افروز رہتے ہیں۔ رہا اس کے سوء استعمال کا مسئلہ، تو اس کا امکان کس چیز میں نہیں؟ مثلاً سواری کی گاڑی جسے نصاب سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، کیا اسے کسی برے مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا؟

یہی حال موبائل فون کا ہے، وہ اب صرف حال احوال پوچھنے یا گپ شپ لگانے کا ذریعہ ہی نہیں، اپنوں کے ساتھ جڑے رہنے اور ان کی خیریت کے بارے میں باخبر رہنے کا ذریعہ ہے۔ کسی مشکل یا مصیبت میں پھنس جائیں تو اپنوں یا پولیس یا ایمبولنس وغیرہ کی بروقت مدد اس سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

زیورات اور زائد از ضرورت مالیت رکھنے والی دیگر چیزیں جو بعض اوقات کسی فوری ضرورت کے رفع کرنے میں صرف نہیں کی جا سکتیں، ان کے ہوتے ہوئے بھی ایسی حاجت مندی پیدا ہو جاتی ہے کہ ایسے افراد کی مدد زکوٰۃ کی مد سے کی جا سکتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں اپنے عمال کو یہ حکم دیا تھا کہ:

''أعطوا من الصدقة من ابقت له السنة غنمًا و لا تعطوها من ابقت له السنة غنمين.

(کتاب الاموال ۱/۶۶۹)

''صدقہ کے مال سے ان کی مدد کرو جن کا قحط سے صرف ایک ریوڑ بچ رہا ہو۔ ان کی مدد نہ کرو جن کے پاس دو ریوڑ بچ رہے ہوں۔''

روایت میں لفظ 'غنم' کا ہے۔ 'غنم' سے مراد بکریوں کا ایک ریوڑ ہوتا ہے جو کم و بیش سو بکریوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سو بکریاں اس حد احتیاج سے بہت زیادہ ہیں جن میں آدمی زکوٰۃ کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اتنی بکریوں کی موجودگی میں تو اس سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے، لیکن اگر قحط یا سیلاب یا کسی دوسری آفت کے سبب سے کسی کا گلہ یا اس کے مویشی تباہ ہو جائیں اور اس کے پاس صرف سو بکریاں بچ رہیں تو وہ بحیثیت ایک غارم کے مستحق ہے کہ حکومت اسلامی صدقات کے فنڈ سے اس کو سہارا دے تاکہ وہ اپنے کاروبار کو سنبھالے رکھ سکے۔''

(مسئلۂ تملیک، مولانا امین احسن اصلاحی ۴۸)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کسی پر کوئی آفت آ پڑے تو اس کے پاس موجود مال یا قابل وصول قرض، کمیٹی اور پراویڈنٹ فنڈ تک کا حساب کرنے نہیں بیٹھ جانا چاہیے، کہ جب تک وہ اپنی زائد از ضرورت اشیا سے دست کش یا محروم ہو کر بالکل محتاج نہ ہو کر رہ جائے، اس کی مدد نہ کی جائے۔ ایسے ریاضیاتی فارمولے دینی معاملات اور دینی امور کے اطلاقات میں تباہ کن اور دین کے مزاج کے خلاف ہیں۔ سماج کوئی ریاضیاتی مسئلہ ہے اور نہ شریعت اس کے مسائل اس انداز میں حل کرتی ہے۔ مسئلہ انسان کی مجبوری اور ضرورت کو رفع کرنا ہے۔ اگر آپ کا ضمیر اس پر اطمینان محسوس کرتا ہے کہ ایسے کسی ضرورت مند کو زکوٰۃ کے بجائے عام صدقہ سے مدد کی جا سکتی ہے تو جان لیجیے کہ اس کی مدد زکوٰۃ سے کرنا بھی اسی طرح درست ہے۔ البتہ زکوٰۃ لینے والے کو حتی المقدور خودداری کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور اپنے وسائل کو کام میں لانا چاہیے تاکہ سماج کے زیادہ محروم طبقات محروم نہ رہ جائیں۔

مسلم اور غیر مسلم فقیر کا امتیاز

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قرآن مجید کے الفاظ 'اُلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰکِیْنِ' کی تعمیم مسلم و غیر مسلم کے استثنیٰ کو بھی قبول نہیں کرتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ایک روایت کے الفاظ سے ایسا سمجھ لیا گیا ہے، مگر ہمارے نزدیک وہ بھی ایسے کسی قانون کا بیان نہیں۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ. ''زکوٰۃ ان کے اغنیا سے لی جائے گی اور ان کے فقرا کی طرف لوٹا دی جائے گی۔'' (بخاری، رقم ۱۳۹۵)

اس روایت سے یہ سمجھا گیا ہے کہ چونکہ زکوٰۃ مسلمانوں سے ہی لی جاتی ہے، اس لیے جب لوٹانے کی بات کی گئی ہے تو اس سے بھی مسلمان ہی مراد ہیں، لیکن روایت میں ایسی کوئی تصریح نہیں، نہ روایت کا اسلوب اس کی کوئی قطعی شہادت دیتا ہے۔ اس روایت میں جب یہ کہا گیا کہ ان کے خوش حال لوگوں سے زکوٰۃ لی جائے تو اس میں تو یہ پہلے سے طے ہے کہ وہ مسلمانوں سے لی جائے گی، کیونکہ یہ فرض ہی مسلمان پر ہوتی ہے، لیکن جب یہ کہا گیا کہ زکوٰۃ ان کے فقرا کی طرف لوٹائی جائے گی تو اس میں زیرِ بحث فقر ہے مسلمانی نہیں۔ ان کے فقرا میں غیر مسلم بھی شامل ہو سکتے ہیں، اگر ان کا استثنیٰ بتانا ہوتا تو اس موقع پر واضح کر دیا جاتا۔ یہ استثنیٰ ان الفاظ سے نہیں نکلتا۔ دوسری بات یہ کہ اسلام کے عمومی مزاج سے بھی یہ بات ہم آہنگ نہیں کہ وہ دنیاوی منفعت کے معاملات میں غیر مسلموں سے امتیاز برتے۔ تیسری بات یہ کہ جب اجتماعی بہبود کے کاموں میں بھی زکوٰۃ خرچ کی جائے گی، جیسا کہ ہم نے ثابت کیا کہ تملیک فقیر

کی کوئی شرط نہیں ہے، تو اس کا فائدہ غیر مسلم شہریوں کو بھی لامحالہ ملے گا۔

سید اور ہاشمی کی تمیز

قرآن مجید میں مصارف زکوٰۃ کی آیت کے الفاظ کی تعمیم سید اور ہاشمی خاندان کے افراد کے استثنا کو بھی قبول نہیں کرتی۔ درست بات یہ ہے کہ ان کے حاجت مندوں کی مدد بھی زکوٰۃ کی مد سے کی جا سکتی ہے۔ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے اور اپنے خاندان کے لوگوں کے لیے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ لینے کی ممانعت فرمائی تھی تو اِس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ تھی کہ اموال فے میں سے ایک حصہ آپ کی اور آپ کے اعزہ واقربا کی ضرورتوں کے لیے مقرر کر دیا گیا تھا۔ اس وجہ سے زکوٰۃ کی مد سے ان کے حاجت مندوں کے لیے مزید فائدہ حاصل کرنا ریاست کے انتظامی اختیار کے تحت منع کر دیا گیا تھا۔ یہ حصہ بعد میں بھی ایک عرصے تک باقی رہا، اس لیے وہ زکوٰۃ وصول نہیں کرتے تھے۔ لیکن اِس طرح کا کوئی اہتمام، ظاہر ہے کہ ہمیشہ کے لیے نہ ہو سکتا ہے اور نہ اُسے کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا بنی ہاشم کے فقرا و مساکین کی ضرورتیں بھی زکوٰۃ کے اموال سے اب بغیر کسی تردد کے پوری کی جا سکتی ہیں۔'' (میزان، جاوید احمد غامدی ۳۵۰)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ii۔ 'عاملین علیہا'

ہمارے فقہا نے اس مد کو عموماً محکمہ زکوٰۃ وعشر کے ملازمین، جو زکوٰۃ کی جمع و تقسیم پر مامور ہوتے ہیں، تک محدود کیا ہے کہ ان کا حق خدمت، یعنی تنخواہ زکوٰۃ کی مد سے ادا کی جائے گی۔ اس کام کا مجاز محکمہ حکومت کے زیر انتظام ہی چل سکتا ہے، اور وہی ان ملازمین کو زکوٰۃ کی مد سے تنخواہ دے سکتی ہے۔ اس بنا پر فقہا ایسی غیر سرکاری تنظیموں کے ملازمین کو زکوٰۃ کی مد سے تنخواہ دینے کو درست نہیں سمجھتے جو اپنے اعتماد پر لوگوں سے زکوٰۃ وصول کر کے عوام کی فلاح میں خرچ کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر ان کا کام، یعنی زکوٰۃ اکٹھا کرنا اور اسے اس کے مصارف میں خرچ کرنا، درست ہے تو ان خدمات پر تنخواہ لینا کس بنا پر درست نہیں؟ جس بنیاد پر انھیں اس خدمت کے لیے جواز دیا گیا ہے، اسی بنا پر حق خدمت لینا جائز کیوں نہیں ہو سکتا؟ ایسے کتنے رضا کار مل سکتے ہیں جو بلا معاوضہ کام کریں۔ معیشت کی تنگی کے اس دور میں لوگ ایک ملازمت اور ایک تنخواہ سے اپنی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہیں، وہاں یہ شرط عائد کرنا کہ اس دینی فریضہ کی ادائیگی کے لیے وہ اپنا وقت تو لگائیں، لیکن اپنی روزی روٹی کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ اختیار کریں، یہ نہ صرف زیادتی ہے، بلکہ اس دینی فریضہ کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا کرنا ہے۔ یہ مطالبہ تو صحابہ سے نہیں کیا

گیا۔انھیں بھی اپنے اس کام کا معاوضہ دیا جاتا تھا، کجا آج اس کے لیے رضا کار ڈھونڈے جائیں۔

اس مسئلے کو ایک اور پہلو سے دیکھیے۔غیر سرکاری تنظیمیں حکومت کی اجازت سے کام کرتی ہیں، اس لحاظ سے اس معاملے میں وہ حکومت کی نائب ہیں۔ چنانچہ جس طرح وہ زکوٰۃ کی جمع وتقسیم میں حکومت کی نائب ہیں، اسی طرح زکوٰۃ کی مد سے اپنے ملازمین کے حق خدمت مقرر کرنے میں بھی اس کی نائب ہوسکتی ہیں۔اس معاملے میں انھیں خدا سے ڈرنے کی نصیحت ہی کی جاسکتی ہے کہ وہ حدود سے تجاوز نہ کریں۔

جیسا کہ پیش تر عرض کیا گیا، ایک مسلم ریاست کی اصل اور مستقل آمدنی زکوٰۃ وعشر اور زمین کا کرایہ ہی ہے، اور اس کا کام حاصل شدہ آمدنی کو عوام کی بہبود پر خرچ کرنا ہوتا ہے۔زکوٰۃ کی آٹھوں مدات دراصل سماجی فلاح کے تمام زمروں کو شامل ہیں، جیسا کہ آگے کی سطور میں بھی ہم دکھائیں گے، اس لحاظ سے ریاست کے تمام ادارے اور اس کے تمام ملازمین دراصل ’عاملین علیہا‘ میں شامل ہیں جو کسی نہ کسی صورت میں سماج کی بہبود میں حکومت کو حاصل ہونے والی آمدنی خرچ کرتے ہیں۔ ’’ریاست کے تمام ملازمین درحقیقت ’العاملين على أخذ الضرائب وردها إلى المصارف‘ (ٹیکس وصول کرنے والے اور اس آمدنی کو اس کے مصارف میں خرچ کرنے والے) ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ نہایت بلیغ تعبیر ہے جو قرآن نے اس مدعا کو ادا کرنے کے لیے اختیار کی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ لوگ بالعموم اِسے سمجھنے سے قاصر رہے ہیں، لیکن اِس کی جو تالیف ہم نے بیان کی ہے، اُس کے لحاظ سے دیکھیے تو اِس کا یہ مفہوم بادنیٰ تامل واضح ہوجاتا ہے۔‘‘ (میزان، جاوید احمد غامدی ۳۴۹)

iii۔’اَلْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ‘

’’زکوٰۃ کا تیسرا مصرف مؤلفۃ القلوب ہیں۔ابن کثیر نے مؤلفۃ القلوب کی مندرجہ ذیل قسمیں گنائی ہیں:

۱۔ایسے غیر مسلم لیڈر اور سردار جن کو اسلام کی طرف مائل کرنا مقصود ہو۔

۲۔ایسے بااثر نومسلم جن کے اسلام سے پھر جانے کا اندیشہ ہو اور جن کا ارتداد اسلام اور مسلمانوں کے لیے مضر ہو سکتا ہو۔

۳۔ایسے بااثر لیڈر جن کی تالیف قلب ان کے ہم چشموں کو اسلام کی طرف مائل کرنے میں مددگار ہوسکتی ہو۔

۴۔ایسے سردار جو اپنے علاقہ میں اسلامی حکومت کو مالیہ کی وصولی میں مدد دیں اور سرحدی علاقوں کو دشمن کے خطرات سے محفوظ رکھنے میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔

...صفوان بن امیہ کو تو کفر پر باقی رہتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے بڑے عطیے دیے، یہاں تک کہ خود

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ان کا اپنا بیان یہ ہے کہ حنین کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیا اور اس وقت میرے نزدیک آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی دوسرا مبغوض نہ تھا، لیکن آپ برابر دیتے رہے، یہاں تک کہ پھر آپ سے زیادہ میرے نزدیک کوئی دوسرا محبوب نہ رہا۔

مذکورہ ناموں اور مذکورہ مقاصد پر ایک نظر ڈال کر ہر شخص خود اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ خرچ ایک بالکل پولیٹیکل خرچ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو جو سیاسی اہمیت اور پولیٹیکل اثر و اقتدار رکھتے ہیں، اسلام اور اسلامی حکومت کے حق میں ہموار کیا جائے اور اگر وہ اسلام کے اندر (کسی نوعیت سے سہی) داخل ہو چکے ہیں تو ان کو اسلام پر مضبوط کیا جائے۔'' (مسئلۂ تملیک، مولانا امین احسن اصلاحی ۳۹-۴۰)

یعنی ہم یہ نتیجہ اطمینان قلب سے نکال سکتے ہیں کہ زکوٰۃ کی مد اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں تمام سیاسی اخراجات کے لیے ادا کی جائے گی۔ یعنی ''وہ لوگ ہیں جن کی اسلامی حکومت کے مصالح کے تحت دل داری پیش نظر ہو۔ بسا اوقات حکومت کو بعض ایسے ذی اثر لوگوں سے معاملہ کرنا پڑتا ہے جو حکومت کی پوری رعیت نہیں ہوتے، بلکہ ایسی پوزیشن میں ہوتے ہیں کہ اگر ان کو بزور قابو میں رکھنے کی کوشش کی جائے تو ڈر ہوتا ہے کہ وہ دشمن سے مل کر مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں۔ خاص طور پر سرحدی علاقوں میں اس طرح کے لوگوں سے بڑے خطرے پہنچ سکتے ہیں اگر یہ دشمن بنے رہیں یا دشمن ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ اس طرح کے لوگوں کو اپنی حمایت میں رکھنا اسلامی حکومت کے مصالح کا تقاضا ہوتا ہے اور اس کی شکل یہی ہوتی ہے کہ ان کی کچھ مالی سرپرستی کی جاتی رہے تاکہ ان کی ہمدردیاں اسلام کے دشمنوں کی بجائے اسلامی حکومت کے ساتھ رہیں۔ یہ ایک پولیٹیکل مصرف ہے جس پر حکومت اپنی دوسری مدوں سے بھی خرچ کر سکتی ہے اور اگر ضرورت محسوس کرے تو اس پر صدقات کی مد سے بھی خرچ کر سکتی ہے۔ یہ مؤلّفۃ القلوب غیر مسلم بھی ہو سکتے ہیں اور نام کے مسلمان بھی۔ اس تالیف قلب سے ایک فائدہ یہ بھی متوقع ہوتا ہے کہ یہ غیر مسلم یا نام کے مسلمانوں سے وابستہ رہنے کے سبب سے اسلام سے قریب تر ہو جائیں۔ ہمارے فقہاء کا ایک گروہ اس مصرف کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات یا بالفاظ دیگر اسلام کے غلبہ کے بعد ساقط قرار دیتا ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ بات کچھ زیادہ قوی نہیں ہے۔ یہ مصرف، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک پولیٹیکل مصرف ہے جو حالات کے تابع ہے، جس کی ضرورت کبھی پیش آتی ہے، کبھی نہیں۔ ایک مضبوط سے مضبوط حکومت بھی بعض اوقات دفع شر کے اس طریقے کو اختیار کرتی ہے، اس لیے کہ جبر اور طاقت کا ذریعہ اختیار کرنے میں نہایت پیچیدہ بین الاقوامی جھگڑے اٹھ کھڑے ہونے کے اندیشے ہوتے ہیں جن میں بروقت الجھنا حکومت کے مصالح

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کے خلاف ہوتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/۵۹۱)

iv۔'فِی الرِّقَابِ'

''اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ اس سے مراد ہر طرح کے غلام ہیں یا صرف وہ غلام مراد ہیں جو اپنے آقاؤں سے ایک متعینہ رقم کی ادائیگی کی شرط پر اپنی آزادی کا اقرار حاصل کر لیتے ہیں، جن کو اصطلاح میں مکاتب کہتے ہیں۔ احناف اور شوافع کے نزدیک اس سے صرف مکاتب مراد ہیں۔ لیکن ابن عباس، حسن بصری، امام مالک، امام احمد بن حنبل، ابوثور، ابوعبید اور امام بخاری وغیرہ کے نزدیک یہ دونوں قسم کے غلاموں کے لیے عام ہے۔ ان کے نزدیک صدقات کی رقم سے ایک غلام کو خرید کر آزاد کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ مکاتب کی اعانت کے مقابل میں اولیٰ و افضل ہے۔ لیکن احناف اور شوافع کے نزدیک صدقات کی مد سے مکاتب کی اعانت تو کی جا سکتی ہے، لیکن کسی غلام کو مستقلاً خرید کر آزاد نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے اس معاملہ میں امام مالک اور امام احمد بن حنبل کا مذہب زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔ اول تو اس سبب سے کہ اس بحث میں سارا مدار سخن حرف لام پر ہے، تھوڑی دیر کے لیے مان لیجیے کہ وہ تملیک ہی کے مفہوم کے لیے خاص ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ 'الرقاب' پر وہ کہاں داخل ہے۔ یہاں سے تو اب 'فی' کا دخل شروع ہو جاتا ہے اور اس کے بعد جتنے مصارف بیان ہوئے ہیں، سب 'فی' ہی کے تحت ہیں۔ 'فی' کے متعلق یہ دعویٰ کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ اس کے اندر بھی تملیک کے مفہوم کا کوئی شائبہ پایا جاتا ہے۔ اس کے اندر تو جیسا کہ اوپر گزرا مصلحت، مفاد اور بہبود کا مفہوم پایا جاتا ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ زکوٰۃ غلاموں کی بہبود اور ان کو آزاد کرنے کے لیے صرف کی جا سکتی ہے، قطع نظر اس سے کہ تملیک پائی جائے یا نہیں۔ ثانیاً، یہ کہ ہم مانے لیتے ہیں کہ تملیک کا مفہوم 'فی' کے اندر بھی گھسا ہوا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ہم ایک غلام کو اس کے مالک سے خرید کر آزاد کر دیتے ہیں تو اس میں تملیک کیوں نہیں پائی جاتی؟ اگر ایک مسکین کو زکوٰۃ کے پیسوں سے روٹی خرید کر دے دیں تو اس صورت میں تملیک پائی جائے گی یا نہیں۔ اسی طرح اگر ایک شخص کو ہم اس کی آزادی خرید کر اس کے حوالہ کر دیتے ہیں تو آخر اس میں تملیک کیوں نہیں پائی گئی؟ یہ ہم نے اس مفروضہ پر عرض کیا ہے کہ تملیک کا مفہوم 'فی' کے اندر بھی لے لیا جائے، لیکن ہمارے نزدیک، جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ صحیح نہیں ہے۔ 'فی' اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ صدقات و زکوٰۃ غلاموں کی بہبود اور ان کی آزادی کی مہم میں صرف کیے جا سکتے ہیں۔ اگر کوئی مکاتب اپنی مکاتبت کی رقم ادا کرنے کے لیے اعانت کا طالب ہے تو آپ اس کو بھی دے سکتے ہیں اور اگر آپ خود کسی غلام کو خرید کر اس کو آزاد کرنا چاہیں تو یہ بھی بے تکلف کر سکتے ہیں، بلکہ خدانخواستہ کسی جنگ کے نتیجہ کے طور پر دنیا میں پھر غلامی کا مسئلہ ہو جائے اور خدمت انسانیت کے نصب العین کو سامنے رکھ کر ایسی انجمنیں قائم ہوں جو ان غلاموں کی

آزادی اوران کی سود و بہبود کے لیے وسیع پیمانہ پرتحریک چلائیں تو اس تحریک پر بھی صدقات وزکوٰۃ کی رقم خرچ کرنے میں کوئی مضایقہ نہیں ہونا چاہیے۔'' (مسئلۂ تملیک، مولانا امین احسن اصلاحی ۴۴)

۷۔ 'اَلْغَارِمِیْنَ'

''زکوٰۃ وصدقات کا مال غارمین کی امداد میں بھی خرچ کیا جاسکتا ہے۔ غارمین سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی کاروباری اتار چڑھاؤ یا حالات کی نامساعدت کے سبب سے قرضے کے نیچے دب گئے ہوں۔ یا کسی آفت ارضی وسماوی، سیلاب یا قحط نے ان کے گلہ یا باغ یا کھیتی یا سرمایہ یا مکانات یا کاروبار کو تباہ کر دیا ہو یا انھوں نے اصلاح ذات البین (فریقین کے درمیان صلح کرانے) کے ارادہ سے دوسروں کی کوئی مالی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہو۔

اس طرح کے لوگوں کی امداد اس نقطۂ نظر سے کی جائے گی کہ یہ معاشرہ کے کماؤ اور قابل افراد ہیں، ان کو گرنے اور تباہ ہونے سے بچایا جائے تاکہ یہ جس چکر میں آ گئے ہیں، اس سے نکل کر پھر اپنی صلاحیتوں سے قوم اور معاشرہ کو بہرہ مند کر سکیں۔ ان کی امداد ان کے فقر یا ان کی مسکنت کی بنا پر نہیں کی جائے گی۔ اگر اس بنا پر کی جانی ہوتی تو ان کا ذکر ایک مستقل عنوان سے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ پھر تو یہ فقرا اور مساکین کے زمرہ میں آپ سے آپ آ جاتے۔ اس وجہ سے ان لوگوں کی احتیاج کے ناپنے کا پیمانہ اس سے بالکل مختلف ہوگا جو فقرا اور مساکین کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ اس کے دلائل ملاحظہ ہوں:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

كتب عمر بن عبد العزيز أن اقضوا عن الغارمين فكتب إليه إنا نجد الرجل له المسكن، والخادم والفرس والأثاث فكتب عمر أنه لا بد للمرء المسلم من مسكن يسكنه، وخادم يكفيه مهنته، وفرس يجاهد عليه عدوه ومن أن يكون له الأثاث في بيته. نعم فاقضوا عنه.

(کتاب الاموال ۵۵۶)

''حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عمال کو یہ فرمان لکھا کہ زیر باروں (غارمین) کے قرضے ادا کیے جائیں۔ ان کے عمال کی جانب سے ان کو یہ اطلاع دی گئی کہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس مکان موجود ہے، نوکر موجود ہے، گھوڑا موجود ہے، گھر میں فرنیچر اور اثاثہ موجود ہے۔ کیا ایسے لوگوں کے قرضے بھی اتارے جائیں؟ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جواب میں لکھا کہ ایک مسلمان کے لیے ایک مکان جس میں وہ رہ سکے، ایک نوکر جو اس کا ہاتھ بٹا سکے، ایک گھوڑا جس پر وہ اپنے دشمن سے مقابلہ کر سکے اور گھر میں کچھ سروسامان تو ناگزیر چیزیں ہیں۔ اس وجہ سے میں کہتا ہوں کہ ہاں، ان لوگوں کے قرضے بھی ادا کرو۔''

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عمال کو یہ شبہ ہوا تھا کہ غارمین جب تک فقر کی اس حد کو نہ پہنچ جائیں

جوفقرا ومساکین کے لیے مقرر ہے، اس وقت تک صدقات کی مد سے ان کے قرضے یا ان کی ذمہ داریاں نہیں ادا کی جاسکتی ہیں، لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے جواب سے یہ بات صاف کر دی کہ اس طبقہ کا صرف فقر دور کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ اس کو اٹھانا مقصود ہے۔ اس وجہ سے اس کی احتیاج کو اس پیمانہ سے نہ ناپو جس پیمانہ سے فقرا و مساکین کی احتیاج کو ناپتے ہو۔'' (مسئلۂ تملیک ۴۶)

vi۔'فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ'

''یہ ایک جامع اصطلاح ہے جس کے تحت جہاد سے لے کر دعوت دین اور تعلیم دین کے سارے کام آتے ہیں۔ وقت اور حالات کے لحاظ سے کسی کام کو زیادہ اہمیت حاصل ہو جائے گی، کسی کو کم جس کام سے بھی اللہ کے دین کی کوئی خدمت ہو، وہ 'فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ' کے حکم میں داخل ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۵۹۳)

قرآن میں 'فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ' کن مفاہیم میں استعمال ہوا ہے، ملاحظہ کیجیے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ.

(البقرہ۲: ۱۵۴)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہاں جہاد و قتال فی سبیل اللہ مراد ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًی لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ لَاخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ. قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ یَّتْبَعُهَآ اَذًی وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ.

(البقرہ۲: ۲۶۲-۲۶۳)

''جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، پھر جو کچھ خرچ کیا ہے، اُس کے پیچھے نہ احسان جتاتے ہیں، نہ دل آزاری کرتے ہیں، اُن کے لیے اُن کے پروردگار کے ہاں اُن کا اجر ہے اور اُن کے لیے نہ وہاں کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ کبھی غم زدہ ہوں گے۔ ایک اچھا بول اور (ناگواری کا موقع ہو تو) ذرا سی چشم پوشی اُس خیرات سے بہتر ہے جس کے ساتھ اذیت لگی ہوئی ہو۔ اور (تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اِس طرح کی خیرات سے) اللہ بے نیاز ہے۔ (اِس رویے پر وہ تمھیں محروم کر دیتا، لیکن اُس کا معاملہ یہ ہے کہ اِس کے ساتھ) وہ بڑا بردبار بھی ہے۔''

اس سے مراد عام لوگوں پر صدقہ و خیرات کرنا ہے۔

لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِیۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِی الۡاَرۡضِ. (البقرہ ۲: ۲۷۳)

''یہ (صدقہ و خیرات، بالخصوص) اُن غریبوں کے لیے ہے جو اللہ کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں، (اپنے کاروبار کے لیے) زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔''

یہ اشارہ ان مہاجرین کی طرف ہے جن کے ٹھکانے اور ذریعۂ معاش کا بندوبست نہ ہو سکا تھا۔ ان کی یہ مجبوری ہجرت کے سبب ہوئی تھی جو خدا کے دین کے لیے کی گئی تھی۔ اسی طرح دین کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تعلم کی مصروفیات میں وقف مستحق افراد کی مالی مدد بھی زکوٰۃ سے کی جا سکتی ہے۔ یہ سب سبیل اللہ میں شامل ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَہُمۡ لِیَصُدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ. (الانفال ۸: ۳۶)

''جن لوگوں نے کفر کیا، وہ اپنا مال اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکیں۔''

یہاں 'سبیل اللہ' سے مراد اسلام بہ حیثیت مجموعی مراد ہے۔

گویا سبیل اللہ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اس میں دینی امور سے متعلق نیکی اور بھلائی کے تمام کام شامل ہیں۔

vii۔ 'وَابۡنِ السَّبِیۡلِ'

''وَابۡنِ السَّبِیۡلِ 'اس کا مستقل ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ مسافر، مجرد مسافر ہونے کی بنا پر اس بات کا حق دار ہوتا ہے کہ صدقات سے اس کو فائدہ پہنچایا جائے۔ مسافرت اس کو ایسی حالت میں ڈال دیتی ہے کہ قانونی اور اصطلاحی اعتبار سے فقیر نہ ہونے کے باوجود بھی وہ ایک اجنبی جگہ میں اپنی بعض ضروریات کے لیے ایسا محتاج ہوتا ہے کہ اگر اس کی دست گیری نہ کی جائے تو وہ اپنے ذاتی ذرائع سے غریب الوطنی میں ان کا کوئی انتظام نہیں کر سکتا۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے سرائیں، مسافر خانے، قیام و طعام، سڑکیں، پلیں وغیرہ کی تعمیر اور رہنمائی کے مراکز قائم کرنا بھی ان کاموں میں شمار ہے جن پر صدقات سے خرچ کیا جا سکتا ہے، یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ بھی 'فی' کے تحت بیان ہوا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ مسافروں کی سہولت اور آسائش کے تمام ضروری کام اس میں شامل ہیں۔''

(تدبر قرآن ۳/ ۵۹۳)

امید کی جاتی ہے کہ علما اور عوام زکوٰۃ کی اس تفہیم پر غور کریں گے اور اس کے درست استعمال کی طرف متوجہ ہوں گے تا کہ خدا کا دین اور زکوٰۃ کے بارے میں اس کی اسکیم پوری طرح فعال ہو کر فرد اور سماج کی بہبود میں کام آ سکے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

تبصرۂ کتب

ڈاکٹر عرفان شہزاد

”درِ ادراک“

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مصنف : محمد تہامی بشر علوی

صفحات : ۶۵۹

ملنے کا پتہ : مکتبہ امام اہل سنت، نزد مدرسہ نصرۃ العلوم، گھنٹہ گھر، گوجرانوالہ۔
فون حافظ طاہر: ۰۳۰۶-۶۴۲۶۰۰۱

تبصرہ نگار : ڈاکٹر عرفان شہزاد

ہمارے محترم دوست جناب محمد تہامی بشر علوی علم وفہم کی دنیا کی ایک منفرد اور نمایاں شخصیت ہیں۔ کم عمری میں ہی، سچ ہے کہ ان کا فہم وبصیرت حقائق کے ادراک میں اپنے معاصرین سے بہت آگے ہے۔ علمی اشغال ان کے لیے انسانی اور سماجی فہم کے لیے سدرہ نہیں بن سکے۔ دردمند دل اور بیدار نگاہ بھی رکھتے ہیں، سماج کے نباض ہیں۔ مولوی کی نفسیات سے واقف ہیں، جدید تعلیم یافتہ طبقے کی ذہنی ساخت سے آشنا ہیں، علما کے ساتھ وابستہ ہیں اور دیہات کے مزاج ومسائل کی اصلاح سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ گویا عالم شش جہات میں شش جہات رکھتے ہیں۔ پھر ہر طبقے کی اصلاح احوال اور اصلاح فکر میں قلم وقرطاس سے لے کر زبان وبیان، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر عملی طور پر میدان میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس سب کے ساتھ ایک نمایاں بات یہ ہے کہ ان کو زبان وقلم کی چاشنی بھی عطا

ہوئی ہے۔ مشکل علمی گتھیاں وہ چٹکلوں میں حل کر دیتے ہیں۔ پند ونصائح میں ان کا اسلوب بزرگانہ شفقت کے بجاے دوستانہ مزاج لیے ہوئے ہے۔ ان کے اصلاحی مضامین پڑھ کر آدمی کی فکر میں سنجیدگی تو آتی ہے، لیکن مزاج میں وہ قنوطیت پیدا نہیں ہوتی جو اصلاحی مضامین کا خاصہ ہوتا ہے۔ جگہ جگہ اشعار کا خوب صورت استعمال مصنف کے عمدہ ذوق کی ترجمانی کرتا ہے۔

اپنے رشحات فکر انھوں نے کتابی صورت میں مرتب کر دیے ہیں، جس کا عنوان ''درادراک، اہم دینی وسماجی تفہیمات'' بہت خوب رکھا ہے۔ اس کتاب کو عکس پبلیکیشنز نے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک میں ''دروس'' ہیں جو وقتاً فوقتاً انھوں نے سماج کے مختلف طبقات کو دیے اور لکھے ہیں۔ دوسرے حصے کو ''شذرات'' کا عنوان دیا ہے۔ اس حصے میں فرد اور سماج کے مختلف اصلاح طلب مسائل زیر بحث لائے ہیں۔ تیسرا حصہ علمی ''مقالات'' پر مشتمل ہے جو آسان اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ یہ سب زندہ مسائل ہیں جن سے آج کا فرد دوچار ہے۔ ہر قاری کو اس میں اپنا ذکر مل سکتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مصنف کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ اس نے اپنی اس کتاب میں دیگر حضرات کے مفید مطلب چند مضامین بھی شامل کیے ہیں۔ ناچیز کے چند مضامین کو بھی اس کتاب کے گوہر پاروں میں جگہ پانے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

کتاب کا انتساب ہی اہل نظر کو اس کتاب کو پڑھنے کی طرف مائل کرنے کے لیے کافی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اپنے جلیل القدر استاذ، مولانا ابوعمار زاہد الراشدی حفظہ اللہ کے نام کہ جن کی آغوش شفقت میں جگہ پانے کو ان کی فکری فرماں برداری ضروری نہیں۔''

آپ بشر صاحب کی حریت فکر کا اندازہ اس ایک جملے سے کر سکتے ہیں۔ دراصل خدا کے علوم ومعارف کھلتے ہی تب ہیں، جب آدمی حتی الوسع حریت فکر کا حامل ہو، دوسروں کی فکری غلامی اور اپنے گروہی اور مسلکی تعصّبات سے آزاد ہو۔ اس کے لیے دیانت دار ہونا ضروری ہے، بشر صاحب کی اس فہم وفراست کے پیچھے مجھے یہی عوامل کارفرما نظر آتے ہیں۔

کتاب میں شامل چند مضامین کے عناوین کتاب کی افادیت کو ظاہر کرنے کے لیے درج کیے جاتے ہیں:

دماغی کنڈیشننگ کا مسئلہ، قرآنی رہنمائی کا اسلوب، اولاد پر اختیار کہاں تک؟ علم کی ناموس کا مسئلہ، جمال میری جان تمھیں کیا ہوا؟ محبت پر بندشیں، رکشہ ڈرائیور، غریب ماں، اب ایسا نہیں چلے گا، مطالعہ بازی، موسیقی وآلات موسیقی کا مسئلہ، مصوری کی حرمت کے استدلال کا جائزہ، ڈاڑھی کے مسئلے کی تحقیق، کیا عورت ٹیڑھی پسلی سے پیدا ہوئی

ہے؟ کیا عورت کی عقل ناقص ہے؟ عورت کی گواہی وغیرہ۔

ایک نوجوان کی خودکشی پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:

''نوجوانوں کو موت کی وادی میں دھکیلنے میں ہمارا کتنا کردار ہے، وہ غور کرتے تو انھیں نوجوانوں کی حرام موت سے پہلے اپنی حرام زندگیاں پہلے نظر آتیں۔'' (۳۰۸)

ایک جگہ انسانی نفسیات کی دکھتی رگ پر یوں ہاتھ رکھتے ہیں:

''خدا سے دعا مانگنی چاہیے کہ وہ ہم جیسے کمزوروں کو کسی ایسی مقبولیت سے بچائے جس کے حصار میں بندھ کر سچائی کی گواہی دینا ناممکن ہی ہو جائے۔'' (۴۴۳)

ایک جگہ یوں نصیحت کرتے ہیں:

''اچھا تو سنو!

یہ تمھیں کیا ہوا کہ صاحب مطالعہ کو صاحب علم کا مترادف سمجھنے لگ گئے ہو؟ ...ذوق مطالعہ سے سرشار میرے لائق تکریم دوستوں کے مطالعے کا وقت بھی مطالعہ میں برباد نہ ہو۔'' (۴۵۷)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مہذب والدین امور میں فیصلہ سازی کی مشق بچوں سے کرواتے ہیں۔ ان کے بچے جوان ہونے تک منصوبہ بندی اور فیصلہ سازی کا ہنر سیکھ چکے ہوتے ہیں۔ ہماری اولادیں والدین کی ماتحتی اور فرماں برداری کے سوا کچھ نہیں سیکھ پاتیں۔ہم نے انھیں بس ماتحت رہنا ہی سکھایا ہوتا ہے۔'' (۳۴۲-۳۴۳)

''ذوق تجسس'' کے نام سے بہت عمدہ مضمون لکھا ہے کہ کس طرح بچپن کی خوئے تجسس جو ہر چھوٹی چھوٹی چیز پر حیرت میں پڑ جاتی ہے، دراصل معرفت الٰہی کا حقیقی ذریعہ ہے، لیکن بچوں کے سوالات سے عدم توجہی اور نامناسب جوابات یہ ذوق تجسس ختم کر دیتے ہیں تو یہ کائنات اپنی تمام نیرنگیوں کے باوجود انسانی تجسس کو ابھارتی نہیں۔ قطرے میں دجلہ دیکھنے کی حس بچپن میں ہی مار ڈالی جاتی ہے۔ قرآن اسی حس کو بیدار کرتا ہے۔ والدین کو بچوں کی یہ حس مرنے نہیں دینی چاہیے۔ ان کے سوالات کو ایڈریس کرنا چاہیے، مگر یہ بڑا مشکل فن ہے۔

نماز کے ایک ایک فعل کی بہت عمدہ اور ایمان افروز تشریح کی گئی ہے۔ کتاب حکمت و بصیرت کے جواہر سمیٹے ہوئے ہے۔

کچھ جگہ پروف کی اغلاط ہیں۔ شہ سرخیوں اور ذیلی سرخیوں میں فرق نہیں کیا گیا، سب کو ایک طرح ہی نمبر وار لکھا گیا ہے۔ کتاب پر قیمت درج نہیں۔ امید ہے، اگلی اشاعت میں یہ معمولی تسامحات بھی درست کر لیے جائیں گے۔

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

شاہد رضا

’’درِ ادراک‘‘: ایک علمی واصلاحی کاوش

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کسی بھی فرد اور معاشرے کی درست سمت کی جانب رہنمائی ایک عظیم فریضہ ہے۔ اس فریضہ کی انجام دہی کے لیے غیر جانب دارانہ تحقیق ودعوت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ علم وتحقیق کے میدان میں سنجیدہ، صحت منداور غیر متعصب تحقیقی اذہان ہی مؤثر دعوت وابلاغ کا فریضہ ادا کر سکتے ہیں، جب کہ تعصب، جذباتیت، جمود وتقلید، مخصوص فکری ذہن، شخصیت پرستی اور مسلک پرستی، نہ صرف مذموم ہیں، بلکہ اس کے لیے سم مسموم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

علم واستدلال جس معاشرے میں اپنی اساسات کھونے لگے؛ مثبت نقد ونظر کی فضا جس علمی میدان میں مکدر ہونے لگے اور علمی جمود جس قوم وملت میں اپنے آپ کو وسعت نظری سے مقفل کر لے، جہالت اور ذلت وپستی اس کا قطعی مقدر ٹھیرتی ہے۔

ہماری اس خودساختہ پیچیدہ دینی وسماجی اجتماعیت میں فکر وتدبر کے رجحان کو فروغ دینے؛ عقل وذہن پر جمود کی اٹی ہوئی گرد کو صاف کرنے؛ اذہان کی منفی (negative) سے مثبت (positive) تفکر کی جانب رہنمائی کرنے؛ فرد اور معاشرے کی ظاہری وباطنی تعمیر کا اہتمام کرنے؛ دین کی درست تعبیر اور اس کے مطابق سماج کی تشکیل کرنے؛ مذہب اور سوسائٹی کے حوالے سے اصلاح طلب حقائق کی توضیح وتنقیح کرنے؛ فکری انتشار اور فرقہ دارانہ کشمکش کو

رفع کرنے؛تعصّبات کے مصنوعی قلعوں اور فصیلوں کو گراتے ہوئے عزت واحترام، ہم آہنگی اور غور وفکر کا ماحول پیدا کرنے کے لیے ''درِادراک'' ایک نہایت ہی اعلیٰ اور قابل عمل سعی ہے۔ مزید برآں، اسلام کو بہ تکلف ثابت کرنا اس کا تقاضا نہیں، بلکہ وہ اصل میں ہے کیا؟ یہ بتانا اس کا تقاضا ہے، اور یہی اس کتاب کی اہم خصوصیت ہے۔

صاحب ''درِادراک'' برادرم محمد تہامی بشر علوی صاحب نے بنیادی دینی وسماجی مسائل اور اپنے تجرباتی ومشاہداتی احساسات کو اپنے دردمندانہ، بے آمیز اور خالص علمی منہج اور عامی ونفسیاتی پہلو سے جس طرح مبرہن کر دیا ہے، وہ لائق تحسین ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ صاحب تصنیف کو دنیا وآخرت میں اس کے اجر سے نوازے؛ ہمیں اس علمی کاوش سے استفادہ کی توفیق فرمائے اور ہم سب کی کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔ آمین

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

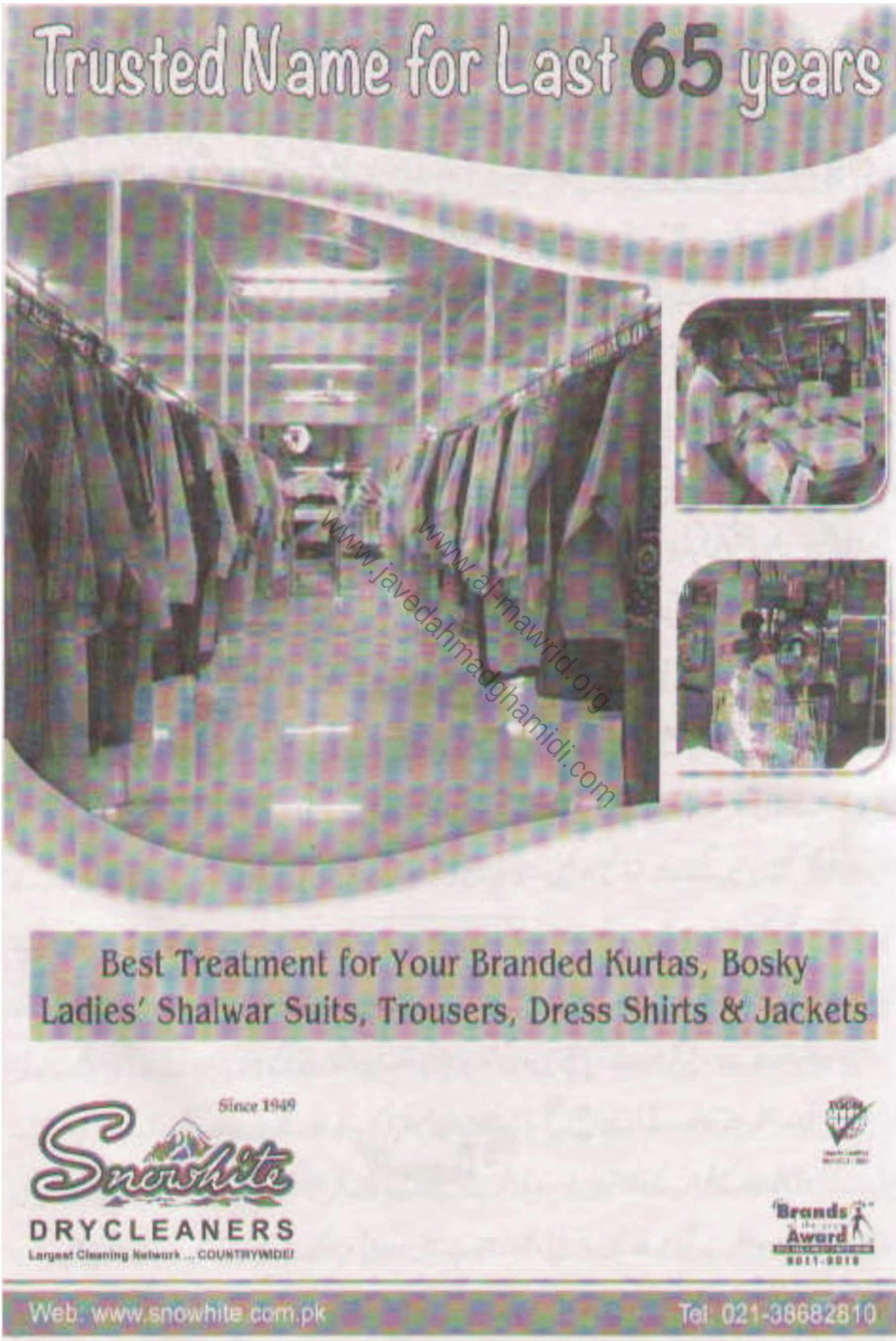

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

Monthly
ISHRAQ
Lahore

Jun 2018
Vol.30 No.6
Regd. No. CPL- 183

Publisher : javed Ahmad Ghamidi printers : Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore

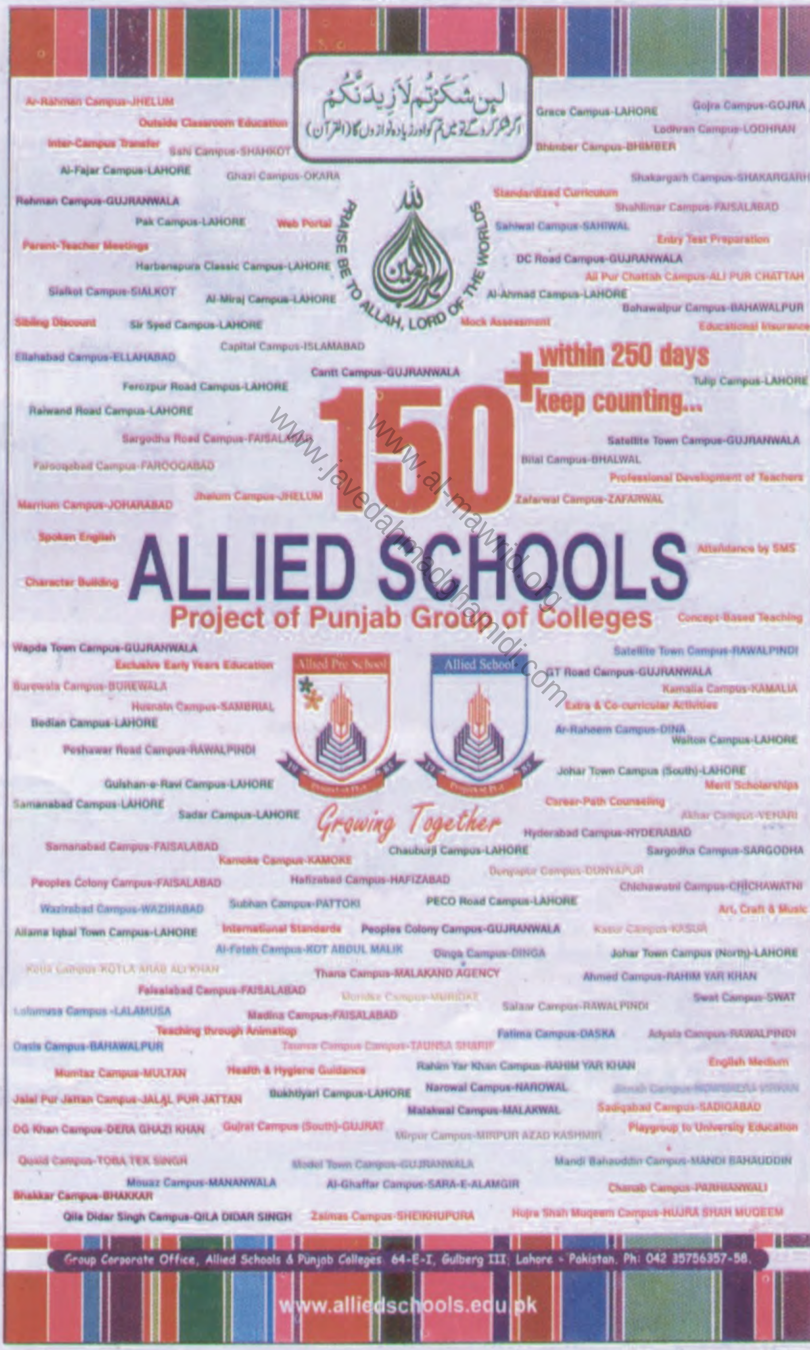

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org